احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

اگست 2024ء

حجیتِ حدیث وسُنت

قرآن مجید کی روشنی میں

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا خصوصی خطاب

الہدایہ 2024ء (آسٹریلیا)

تشکیلِ معاشرہ کا ضابطۂ اخلاق

نالج بیسڈ اکانومی اور پاکستان کی ترقی

استحکامِ پاکستان کے تقاضے

الہدایہ 2024ء (آسٹریلیا)

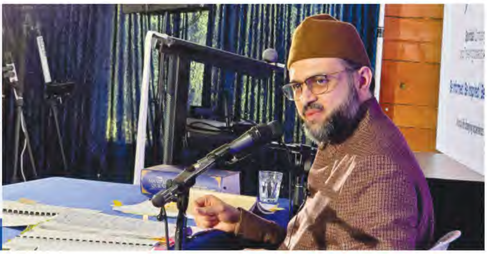

احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

بفیضانِ نظر
قدوۃ الاولیاء شیخ المشائخ حضرت سیدنا طاہر علاؤالدین الگیلانی البغدادی قدس سرہ العزیز

زیرِ سرپرستی
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ

زیرِ نگرانی
ڈاکٹر حسن محی الدین قادری | ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

جلد: 38 / شمارہ: 8 / صفر المظفر ۱۴۴۶ھ / اگست 2024ء

چیف ایڈیٹر نور اللہ صدیقی

ایڈیٹر محمد یوسف

ڈپٹی ایڈیٹر محبوب حسین

ایڈیٹوریل بورڈ

محمد رفیق نجم، ڈاکٹر محمد فاروق رانا، عین الحق بغدادی
محمد بلال اُپل، سید علی عباس بخاری، فیصل حسین مشہدی

مجلس مشاورت

خرم نواز گنڈاپور، احمد نواز انجم، جی ایم ملک
محمد جواد حامد، سرفراز احمد خان، منظور حسین قادری
غلام مرتضیٰ علوی، علی عمران، داؤد حسین مشہدی

قلمی معاونین

مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی، محمد شفقت اللہ قادری
ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی، ڈاکٹر محمد افضل قادری

حسن ترتیب

اداریہ: اسلام کی نشأۃ ثانیہ علم سے ممکن ہے	چیف ایڈیٹر	3
القرآن: حجیت حدیث وسنت (قرآنِ مجید کی روشنی میں)	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	6
آپ کے فقہی مسائل	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی	16
تشکیلِ معاشرہ کا ضابطہ اخلاق	ڈاکٹر حسن محی الدین قادری	22
فقہ واصول کی تدوین کی ضرورت واہمیت	مفتی ارشاد احمد ساحل	34
نالج بیسڈ اکانومی اور پاکستان کی ترقی	پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری	43
پاکستان کا معاشی بحران اور ٹیکس سسٹم	ڈاکٹر علی اکبر الازہری	54
استحکامِ پاکستان کے تقاضے	محمد علی قادری	66
الہدایہ 2024ء (آسٹریلیا)	خصوصی رپورٹ	75

ملک بھر کے تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
www.minhaj.info
www.facebook.com/minhajulquran
email:mqmujallah@gmail.com (مجلّہ آفس وسالانہ خریداران)
minhaj.membership@gmail.com (نظامت ممبرشپ/رفقاء)
smdfa@minhaj.org (بیرون ملک رفقاء)

کمپیوٹر آپریٹر محمد اشفاق انجم | گرافکس عبدالسلام
خطاطی محمد اکرم قادری | عکاسی قاضی محمود الاسلام

قیمت فی شمارہ 60 روپے | سالانہ خریداری 700 روپے

انتباہ! مجلّہ منہاج القرآن میں آنے والے جملہ پرائیویٹ اشتہار خلوص نیت سے شائع کیے جاتے ہیں ادارہ کی کسی کاروبار میں شراکت ہے اور نہ ہی ادارہ فریقین کے درمیان کسی بھی قسم کے لین دین کا ذمہ دار ہوگا۔

بدل اشتراک مشرق وسطی جنوب مشرقی ایشیاء، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا، مشرق بعید جنوبی امریکہ وریاستہائے متحدہ امریکہ 30 امریکی ڈالر سالانہ

ترسیل زر کا پتہ اکاؤنٹ نمبر 02930103644000 میزان بینک شالیمار لنک روڈ لاہور پاکستان

ناشر: محمد اشرف قادری، مطبع: منہاج القرآن پرنٹرز 365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور UAN:042-111-140-140 Ext: 128

حمدِ باری تعالیٰ

تو ہی رحمٰن ہے رحیم ہے تو
میرے مولا! بڑا کریم ہے تو

انجمن انجمن ترے جلوے
بوئے گل ہے کہیں شمیم ہے تو

ہر کوئی سرنگوں ہے تیرے حضور
ہر شہنشاہ سے عظیم ہے تو

دور ہے آنکھ کی رسائی سے
ہاں دلوں میں مگر مقیم ہے تو

ہے ترے پاس سب حسابِ عمل
کاتب و محرم و منیم ہے تو

تو کہ جبار ہے قہار بھی ہے
اور کرم گستر و حلیم ہے تو

تجھ سے پوشیدہ کب عمل ہے کوئی
سب تجھے علم ہے علیم ہے تو

صابریؔ پُرخطا ترا بندہ
طالبِ فضل ہے رحیم ہے تو

محمد علی صابری

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

ہر وقت یہ دعا ہے خدائے رحیم سے
سرکارِ دو جہاںؐ کی اطاعت نصیب ہو

محشر کے روز جب بھی کھلے دفترِ عمل
آقائے محتشمؐ کی شفاعت نصیب ہو

سر پر رکھی ہوئی ہیں گناہوں کی گٹھڑیاں
چشمِ ادب کو اشکِ ندامت نصیب ہو

محشر سے قبل جتنے بھی ادوار ہیں انہیں
سردارِ انبیاؑء کی شریعت نصیب ہو

بعد از نماز اپنے خدا سے یہی کہا
جو بھی ملے نبیؐ کی بدولت نصیب ہو

امت کے حالِ زار پر آقاؐ کرم کی چھاں
جو چھن چکی ہے پھر وہی عظمت نصیب ہو

گردش لہو کی تھمنے لگی ہے مرے حضورؐ
مردہ دلوں کو پھر سے حرارت نصیب ہو

آثارِ شہرِ علم کو پڑھتا رہوں ریاضؔ
گردِ رہِ نبیؐ کی بصارت نصیب ہو

ریاض حسین چودھریؔ

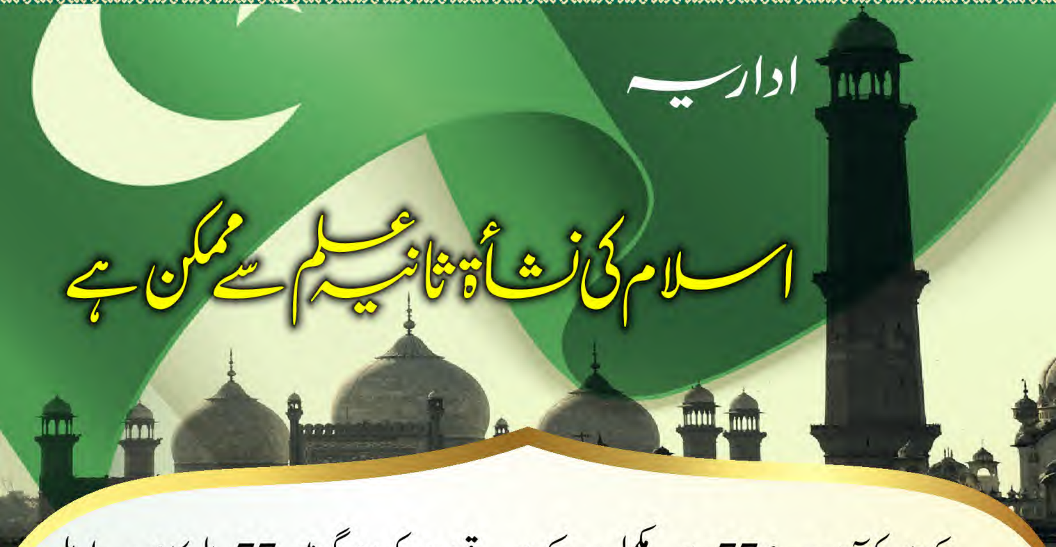

اداریہ

اسلام کی نشأۃ ثانیہ علم سے ممکن ہے

پاکستان کو آزاد ہوئے 77 برس مکمل ہو چکے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں 77 سال کا عرصہ طویل عرصہ شمار نہیں ہوتا تاہم پاکستان کی قومی، معاشرتی، اقتصادی، جمہوری زندگی کے حوالے سے 7 دہائیوں میں بڑے اتار چڑھاؤ اور مدوجزر آئے۔ پاکستان نے اس عرصہ کے دوران بہت کچھ کھویا بھی اور پایا بھی۔ اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ میری رحمت سے کبھی مایوس مت ہونا اور کبھی امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دینا یعنی جُہد مسلسل کو اپنا شعار بنائے رکھنا اور مجھ سے میری نعمتیں طلب کرتے رہنا۔ ہم اس صدی کے ترقی یافتہ ممالک کی تاریخ پر نگاہ دوڑائیں تو یہ اقوام فتنہ وفساد، قتل وغارت گری، چھینا جھپٹی، کاہلی، سستی، ناامیدی میں غرق نظر آتی ہیں پھر انہی اقوام نے علم اور محنت کو جب اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تو یہی اقوام دنیا کی امام بن گئیں اور دنیا کو تہذیب و ترقی کا درس دینے لگیں۔ جب یہ اقوام غربت وجہالت اور ناامیدی کے اندھیروں کا شکار تھیں تو تب اُمتِ مسلمہ علم و ہنر کے سفر پر گامزن تھی اور دنیا کو جینے کا ڈھنگ سکھا رہی تھی۔ سائنسی علوم پر دسترس کی وجہ سے ہر آئے روز انسانیت کو ایجادات کے تحفے دے رہی تھی اور آسانیاں بانٹ رہی تھی۔

تحریک آزادی اور جدوجہدِ آزادی کی بہت ساری جہتیں ہیں، ان میں ایک مسلمانوں کو علم کی روشنی سے دور رکھنا تھا۔ برصغیر میں آباد دیگر اقوام کو حصولِ علم کے لئے جو آسانیاں اور سہولتیں میسر تھیں وہ مسلمانوں کو میسر نہیں تھیں۔ مسلمانوں کو غلام بنائے رکھنے کے لئے انہیں علم اور مراکزِ علم سے دور کر دیا گیا تھا اور تحریک آزادی کے دوران مسلمان اس امید کے ساتھ بانی پاکستان کی سرپرستی میں حصولِ آزادی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے کہ الگ اور آزاد خطۂ وطن کے اندر ہم جہاں آزادانہ مذہبی اقدار واطوار اپنا سکیں گے، وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دنیا کی ایک بہترین قوم بن کر بھی ابھریں گے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ بھی اس حقیقت سے باخبر تھے کہ علم ہی ترقی کا راستہ اور کامیابی کی

کنجی ہے۔ آپ ہمیشہ نوجوانوں کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ آپ نے زمانۂ طالب علمی کے دوران علم پر توجہ مرکوز رکھنی ہے اور کسی کا آلہ کار نہیں بننا۔ علم آزادی ہے اور جہالت غلامی ہے۔ بانی پاکستان نوجوانوں کو یہ نصیحت کرتے تھے کہ آپ سیاسی مسائل میں ضرور دلچسپی لیں لیکن اس سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ اس دلچسپی کی خاطر تعلیم کو چھوڑ دیں۔ سیاست کو علم اور مطالعہ پر ہرگز ترجیح نہ دیں۔ نئے میدان، نئے راستے اور نئی منزلوں کے مسافر بنیں۔

افسوس بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی اس فکر کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ 77 سال کے بعد بھی شرح خواندگی 60 فیصد سے کم ہے۔ اگرچہ دعویٰ 62 یا 64 فیصد کا کیا جاتا ہے مگر عملاً ہماری تعلیمی حالت ناقابل بیان ہے۔ اگر آزادی کے بعد ہر سال شرح خواندگی میں ایک فیصد بھی اضافہ ہوتا تو آج شرح خواندگی 77 فیصد ہوتی۔ اب تک جتنے بھی سربراہانِ مملکت اقتدار پر براجمان ہوئے سب نے تعلیم کی ترقی کا نعرہ لگایا، تعلیمی پالیسیاں دیں مگر معیارِ تعلیم اور شرح خواندگی میں اضافہ خواب ہی رہا۔

ہم وہ اُمت ہیں جس کے پیغمبرِ حق نے ہر مرد و خواتین پر حصولِ علم کو فرض قرار دیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے حصولِ علم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اُمت کو متعدد جوامع الکلم عطا فرمائے ہیں:

☆ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”علم حاصل کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے علم سیکھنا خوفِ الٰہی پیدا کرتا ہے اور اس کا طلب کرنا عبادت ہے اور اس کا مذاکرہ تسبیح ہے اور اس کی جستجو میں لگے رہنا جہاد ہے۔ بے علم کو علم سکھانا صدقہ ہے اور جو اس کا اہل ہو اس پر خرچ کرنا اللہ کی قربت کا باعث ہے۔ حلال و حرام کا فہم حاصل کرنے کے لئے علم نشانِ راہ ہے“۔

☆ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ سخیوں کا سخی کون ہے؟ اللہ تعالیٰ سب سخیوں کا سخی ہے اور میں اولادِ آدم میں سب سے بڑا سخی ہوں، میرے بعد لوگوں میں سب سے بڑا سخی وہ شخص ہوگا جس نے علم حاصل کیا، پھر اُس علم کو دوسروں تک پہنچایا۔ قیامت کے دن اُس ایک شخص کو پوری اُمت کے برابر کھڑا کیا جائے گا“۔

☆ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں بے شک ایک عالم دین پوری عمر دن کو روزہ رکھنے، رات کو قیام کرنے اور میدانوں میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے شخص سے زیادہ اجر کا مستحق ہے“۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب علم اور مصادرِ علم میں احادیث رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں علم کی فضیلت و اہمیت پر ایک فکر انگیز باب قائم کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں علم دنیوی ترقی و کامیابی کا زینہ تو ہے ہی مگر بطور مسلمان حصولِ علم، خشیتِ الٰہی کا سبب ہے۔ یہ

عبادت و تسبیح ہے، اس کی جستجو جہاد ہے، اس کا فروغ صدقہ ہے، یہ قربت الٰہی کا ذریعہ ہے، حلال و حرام میں تمیز سکھاتا ہے، علم نفلی عبادات میں سر فہرست ہے، علم میں اضافے کی دعا اور جستجو کرنا سنت انبیاء ہے، حصولِ علم کے لئے سفر کرنا پیغمبرانِ خدا کی سُنت ہے۔ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری وہ نابغۂ روزگار ہیں کہ جنہوں نے علم کے فضائل فقط تحریر و تقریر تک بیان نہیں فرمائے بلکہ انہوں نے اُمت کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بے مثال تعلیمی ادارے بھی قائم کئے جن میں منہاج یونیورسٹی لاہور، کالج آف شریعہ اینڈ اسلامک سائنسز، ویمن کالج برائے خواتین، نظام المدارس پاکستان، آغوش گرائمر سکول، منہاج ایجوکیشن سوسائٹی، تحفیظ القرآن انسٹی ٹیوٹ اور الاعظمیہ نمایاں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں مدینۃ الزہرہ، مانچسٹر کالج سمیت دنیا بھر میں قائم اسلامک سنٹرز علم کے نور کو عام کر رہے ہیں۔ یہاں سے ہزارہا طلبہ و طالبات اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مثبت اور فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ منہاج القرآن وہ واحد تحریک ہے جس کے اندر بڑی تعداد میں پی ایچ ڈی، ایم فل سکالرز موجود ہیں اور فرید ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ منہاج القرآن کے پلیٹ فارم سے اپنا علمی، تحقیقی فریضہ انجام دے رہا ہے۔ تاہم کسی ایک تحریک اور ایک شخصیت کے تعلیمی و تحقیقی کردار سے وہ جامع مقاصد حاصل نہیں کئے جا سکتے جن کا تعین تحریک پاکستان کے دوران بانیٔ پاکستان کی سرپرستی میں کیا گیا تھا۔ حکومت کوئی بھی ہو، اُسے پہلی ترجیح فروغِ علم بنانا ہوگی اور تعلیم سے محبت فقط بیانات تک نہیں ہونی چاہیے بلکہ بجٹ کے اندر بھی اس کی جھلک نظر آنی چاہیے۔ پاکستان ان ممالک کی فہرست میں شامل ہے جہاں تعلیم پر سب سے کم رقوم خرچ کی جاتی ہیں۔ جب تک ہم تعلیم کو عملاً اپنی اولین ترجیح نہیں بنائیں گے، ہمارے حالات تبدیل نہیں ہوں گے۔ تعلیم کے فروغ کی پالیسی سیاست سے بالاتر ہونی چاہیے۔

یوم آزادی کے اس پر سعید موقع پر ہمیں اس عہد کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے کہ ہم اپنی ماضی کی غلطیوں کو دہرانے کی بجائے ان سے سبق حاصل کریں گے، اپنی اصلاح کے ساتھ آگے بڑھیں گے اور زیادہ سے زیادہ وسائل تعلیم و تحقیق پر خرچ کریں گے، چاہے ہمیں بھوکا ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔ اللہ رب العزت نے پاکستان کو بے بہا قدرتی نعمتوں، معدنی خزانوں، بہترین سمندروں، پہاڑوں، سرسبز میدانوں، جنگلات، باغات اور انواع و اقسام کے میوہ جات سے مزین و مرصع زمین کا شاداب ٹکڑا عطا کیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کروڑوں عوام اور پر عزم نوجوانوں کی افرادی قوت سے نوازا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قدرت کی ان نعمتوں کو کماحقہ بروئے کار لایا جائے۔

(چیف ایڈیٹر: ماہنامہ منہاج القرآن)

حجیتِ حدیث وسنت
قرآن مجید کی روشنی میں

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا خصوصی خطاب

حصہ 5

ترتیب وتدوین: محمد یوسف منہاجین

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو۔“

(النساء، ۴: ۵۹)

زیرِ نظر مضمون میں ہم قرآن و حدیث کی روشنی میں عقائدِ صحیحہ کے باب میں عقائد کی پرکھ، جانچ پڑتال، صحیح عقائد کو غلط عقائد سے ممتاز کرنے اور عقائد کی صحیح اور غلط تعبیر و تشریح میں فرق کرنے کے اصول و ضوابط کا مطالعہ کررہے ہیں۔ اس مضمون کے حصہ 4 (شائع شدہ ماہنامہ منہاج القرآن ماہ جولائی 24ء) میں ہم نے اس methodology (طریقہ کار) پر باقاعدہ بات کا آغاز کیا تھا اور اس ضمن میں پہلا نکتہ یہ زیرِ غور آیا کہ آج لادینیت چاہنے والے، اپنی زندگی کو دین سے عملاً خالی رکھنے والے اور دین کی حدود و قیود اور احکام سے گریز کرنے والے لوگ اس بات کا پرچار کررہے ہیں کہ ہم صرف وہ مانیں گے جو قرآن مجید میں آیا ہے اور اس کے سوا کوئی اور چیز یعنی سنت اور حدیث کو حجت نہیں مانتے۔ اس حوالے سے وہ مختلف اسباب کو بطورِ بہانہ بیان کرتے ہیں۔ اگر یہ عقیدہ بنالیا

(خطاب نمبر: Ci -27)(8 دسمبر 2013ء)(مقام: کینیڈا)

جائے کہ صرف قرآن کافی ہے اور قرآن کے سوا اور کوئی شے یعنی سنت اور حدیث نبوی حجت نہیں تو اس سے نہ صرف قرآن مجید کا انکار لازم آتا ہے بلکہ پورے دین کا انکار ہو جاتا ہے۔ اس سوچ اور عمل سے دین ایک کھلونا بن جاتا ہے اور آیاتِ کریمہ کی تاویلاتِ باطلہ کا راستہ کھل جاتا ہے۔

قرآن مجید میں تقریباً ڈیڑھ سو آیات ایسی ہیں جن سے حضور نبی اکرم ﷺ کی اطاعت، سنت، اسوۂ حسنہ، فرامین وارشادات، آپ ﷺ کے فیصلے اور آپ ﷺ کے حکم کا فرض اور واجب ہونا لازم آتا ہے۔ پس ''صرف قرآن ہی کافی ہے''، اس ایک جملے کے کہنے سے قرآن مجید کی ان ڈیڑھ سو آیات کا انکار ہو جاتا ہے۔ نہ صرف ان ڈیڑھ سو آیات کریمہ بلکہ ان آیات کے علاوہ بھی احکام و عقائد کے باب میں قرآن مجید کی سیکڑوں تعلیمات کا کوئی مفہوم اور مراد متعین ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ ہر شخص ان آیات کی من مانی تاویل کر کے ان کی تضحیک کرے گا، انھیں تختِ مشق بنا لے گا اور اس طرح دین اسلام کا کُلی طور پر انکار ہو جائے گا۔

بطور نمونہ چند آیات ملاحظہ ہوں جن سے واضح ہو گا کہ محض قرآن مجید ہی کو حجت ماننے سے کس طرح کی آیات کا انکار لازم آتا ہے:

اطاعتِ رسول ﷺ کا الگ وجود اور اتھارٹی

اللہ رب العزت نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے (اَہلِ حق) صاحبانِ اَمر کی۔'' (النساء، ۴:۵۹)

اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے محبوب ﷺ کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے اس آیت کریمہ کے درمیان ''واؤ عاطفہ'' لگائی ہے۔ واؤ عاطفہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دو الگ الگ چیزوں کو بیان کیا جا رہا ہے۔ مثلاً: اگر کوئی یہ کہے کہ اپنے والدین کا ادب کرو اور اپنے اساتذہ کا ادب کرو۔ تو اس کا مطلب واضح ہے کہ والدین اور استاد الگ الگ رشتے ہیں اور دونوں کے ادب و احترام کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں لے سکتے کہ کہنے والا تو والدین کا ادب کرنے اور اساتذہ کا ادب کرنے کا کہہ رہا ہے اور سننے والا کہے کہ ''والدین کا ہی ادب کرو، وہی اساتذہ ہوتے ہیں اور پھر اساتذہ کے احکامات ماننے سے انکار کر دے کہ ان کے ادب کا حکم نہیں دیا، اساتذہ سے مراد والدین ہی ہیں۔'' تو یہ طرزِ عمل درست نہ ہو گا بلکہ اس کی سینہ زوری اور مذاق کہلائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی کہے کہ عمر اور ابو بکر مجھے ملنے آئے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ دو آدمی آئے، ایک کا نام عمر ہے اور ایک کا نام ابو بکر ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو ایک آدمی آیا، وہی عمر ہے اور وہی ابو بکر ہے۔

اسی طرح مذکورہ آیت کریمہ میں واؤ عاطفہ استعمال کر کے واضح فرما دیا کہ اللہ کی اطاعت کا اپنا الگ وجود ہے اور رسول کی اطاعت کا بھی اپنا الگ وجود ہے۔ یہاں واؤ بیانیہ نہیں ہے جو پہلے بیان کردہ کی تفصیل اور تبیین کے لیے آتی ہے بلکہ واؤ عاطفہ ہے جس سے دو چیزوں کا فرق واضح ہوتا ہے۔

پھر ارشاد فرمایا: وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ یعنی اُن کی بھی اطاعت کرو جو تمہارے امراء، ائمہ اور پیشوا ہیں۔ ان کے لیے لفظ أَطِيْعُوْا کو نہیں دوہرایا۔ اس لیے کہ اُن کی اطاعت مشروط ہے۔ پس اس آیتِ کریمہ میں واؤ عاطفہ کے ساتھ تین الگ الگ طاعات کے حکم دیے:

۱۔ اللہ کی اطاعت ۲۔ رسول کی اطاعت

۳۔ اولی الامر کی اطاعت

جب واؤ عاطفہ لگتا چلا گیا تو اب three in one نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کیا تو یہ اس آیت کا کھلا انکار ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرآن مجید میں موجود اس کے احکام کے سوا کوئی شے حجت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اَطِيْعُوا اللهَ اور اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کو الگ الگ بیان نہ فرماتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تو وہ ہو گیا جو قرآن مجید میں ہے تو پھر رسول کا حکم کون سا ہے۔۔۔؟ اگر رسول کا حکم بھی وہی ہے جو قرآن مجید میں ہے تو دوبارہ أَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ کہنے کی ضرورت کیوں ہے۔۔۔؟ اگر اطاعتِ رسول کا حکم بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت آ گیا تو اطیعوا الرسول نہ کہا جاتا اور اَطِيْعُوا اللهَ کہنا ہی کافی ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کی شکل میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور اَطِيْعُوا اللهَ کہنے سے بات پوری ہو گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم اور قرآن مجید کی حجت واضح ہو گئی ہے تو اب ''اطیعوا الرسول'' کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔

قرآن مجید کے اس اسلوب سے معلوم ہوا کہ اگر رسول کے حکم کا الگ سے کوئی وجود اور اتھارٹی نہ ہوتی تو اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کو الگ سے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ پس اطاعتِ رسول بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح اپنا ایک الگ وجود اور اتھارٹی رکھتی ہے۔ اطاعتِ الٰہی کا الگ ذکر اور اطاعتِ رسول کا الگ ذکر کرنا، معاذ اللہ بے معنی نہیں ہے۔ قرآن مجید کے ایک ایک لفظ کا ایک معنی، مراد اور ضرورت ہے۔ پس یہ کہنا کہ قرآن مجید کے سوا کوئی شے حجت اور ضروری نہیں ہے، یہ اس آیت مبارکہ کا کھلا انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ میرے حکم کی بھی ضرورت ہے اور میرے رسول کے حکم کی بھی ضرورت ہے اور ہم کہہ رہے ہیں کہ رسول کے حکم اور اطاعت کی ضرورت نہیں ہے۔ پس ایسا کہنا کفر ہے۔

☆ ایک اور مقام پر اللہ رب العزت نے فرمایا:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

”اور جو کچھ رسول (ﷺ) تمہیں عطا فرمائیں سو اُسے لے لیا کرو اور جس سے تمہیں منع فرمائیں سو (اُس سے) رُک جایا کرو۔“ (الحشر، ۵۹: ۷)

اللہ رب العزت نے اس آیت میں بھی واضح طور پر حضور علیہ السلام کے حکم، سنت اور حدیث کی حجیت کو بیان کر دیا۔ یہ کہنا کہ قرآن مجید کے سوا ہم کسی شے کو نہیں مانتے، کوئی حجت نہیں ہے“، ایسا کہنا اس آیت کا بھی انکار ہے اور صریح کفر ہے۔

اطاعتِ رسول ﷺ کے بغیر اطاعتِ الٰہی ممکن نہیں

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء، ۴: ۸۰)

”جس نے رسول (ﷺ) کا حکم مانا، بے شک اس نے اللہ (ہی) کا حکم مانا۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے ایک بنیادی فلسفہ عطا فرمایا ہے کہ اُس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم کو ماننا ممکن ہی نہیں ہے جو پہلے رسول کے حکم کو نہیں مانتا۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ”آج رسول اللہ ﷺ کے زمانے کو چودہ سو سال گزر گئے، لہذا صرف اللہ کا فرمان حجت ہے اور رسول کی حدیث و سنت، فرمان، آپ ﷺ کا اسوۂ و سیرت اور آپ ﷺ کے فیصلے میرے لیے حجت نہیں“، تو ایسا کہنے والا اللہ تعالیٰ کے مذکورہ فرمان کا انکار کرنے والا ہے۔ اس لیے کہ وہ تو فرماتا ہے کہ میرے فرمان اور حکم کو وہی شخص مانتا ہے جو میرے رسول کا فرمان اور حکم مانے۔۔۔ میری اطاعت وہی شخص بجالاتا ہے جو پہلے میرے رسول کی اطاعت بجالائے۔۔۔ میرے رسول کی اطاعت بجالائے بغیر میری اطاعت ہی نہیں ہے۔۔۔ اور رسول کا حکم ماننے کے بغیر میرے حکم کا ماننا ممکن ہی نہیں۔

پس اللہ رب العزت نے ایک فارمولا اور اصول دے دیا کہ میرے حکم کو ماننے کا معنی ہی یہ ہے کہ پہلے رسول کے حکم کو مانا جائے۔ حدیث و سنت کو پہلے حجت مانیں گے تب قرآن مجید کا حجت ماننا قبول ہوگا۔ پس ایسا کہنا کہ ”قرآن کے سوا کوئی شے حجت نہیں“، یہ اس آیت کریمہ کا بھی انکار ہے۔

انبیاء ورسل کی بعثت کا مقصد ان کی اطاعت بجالانا ہے

اللہ رب العزت نے فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء، ۴: ۶۴)

’’اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔‘‘

اس آیت کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ ہم رسولوں کو صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ اللہ کے اذن سے لوگ اُن کے حکم کو مانیں۔۔۔ اُن کی اطاعت کریں۔۔۔ اُن کے اسوہ کی پیروی کریں۔۔۔ اُن کے ہر ارشاد پر عمل پیرا ہوں۔۔۔ اُن کے حکم، فرمان، عمل اور تعلیمات کو حجت اور واجب سمجھیں اور اپنی زندگی میں اپنائیں۔

اگر یہ کہا کہ ’’قرآن کے سوا کوئی شے حجت نہیں ہے‘‘ تو ایسا کہنا اس آیت کا بھی کھلا انکار ہوگیا۔ اس لیے کہ کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ نبی علیہ السلام کے اقوال و افعال حجت ہیں اور ہم کہہ رہے ہیں کہ نہیں، صرف اللہ کا کلام حجت ہے۔ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے کلام اور قرآن مجید کو واقعتاً حجت مانتے تو جو قرآن مجید نے کہا ہے، اُس کو حجت سمجھتے۔ یہ قرآن مجید ہی تو کہہ رہا ہے کہ رسولوں کو اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ اُن کو حجت سمجھا جائے اور اُن کے فرمان اور سنت و حدیث کو واجب سمجھا جائے۔ قرآن مجید کو حجت سمجھنے والے قرآن مجید کے اس فرمان کو بھی تو مانیں کہ قرآن مجید کہہ رہا ہے کہ جس نے رسول کے حکم کو حجت مانا اور واجب جانا، اُسی نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو حجت مانا۔

اسوۂ حسنہ پر عمل آپ ﷺ کو حجت مانے بغیر ممکن نہیں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب، ۳۳: ۲۱)

’’فی الحقیقت تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ کی ذات) میں نہایت ہی حسین نمونۂ (حیات) ہے۔‘‘

اللہ رب العزت کا یہ خطاب غیر مسلموں کے لیے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے ہے۔ قرآن مجید ان سے مخاطب ہے جو لَکُمۡ میں آتے ہیں کہ قرآن مجید پر ایمان لانے والے سن لیں کہ قیامت تک آقا علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ، ارشادات و فرمودات اور جو کچھ آپ ﷺ نے عمل کیا، یہ تمام تمہارے لیے خوبصورت طرزِ زندگی ہے۔ قرآن مجید نے جسے قیامت تک امتِ مسلمہ کے لیے ماڈل قرار دیا، اسی کو ہم کہیں کہ وہ حجت ہی نہیں تو اس طرح کی سوچ رکھنے والوں نے رسول اللہ ﷺ کا انکار نہیں کیا بلکہ اس آیت کا بھی انکار کردیا اور قرآن مجید کا بھی انکار کردیا۔

حبِ الٰہی کا حصول بھی رسول اللہ ﷺ کو حجت ماننے سے ہی ممکن ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ۔

’’(اے حبیب!) آپ فرما دیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا۔‘‘ (آل عمران، ۳: ۳۱)

اس آیت کریمہ میں قرآن مجید نے ایک شرط لگا دی کہ اگر تم حضور علیہ السلام کی اتباع نہیں کرو گے، آپ ﷺ کے ہر حکم اور ہر عمل کو اپنے لیے واجب نہ جانو گے اور اسے اپنی زندگی میں نافذ نہ کرو گے تو نہ تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے ہو اور نہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے والا ہے۔

یہ کہنا کہ ’’قرآن مجید کے سوا کوئی شے حجت نہیں، ہم صرف قرآن کو مانتے ہیں‘‘ ایسا کہنے والے اس آیت کریمہ کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ اس کی محبت کے حصول کا راز ہی رسول اللہ ﷺ کی سنت و حدیث کو حجت ماننے اور آپ ﷺ کی اتباع و اطاعت کرنے میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو حجت ماننے میں تکمیلِ ایمان ہے

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا۔

’’پس (اے حبیب!) آپ کے رب کی قسم یہ لوگ مسلمان نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ وہ اپنے درمیان واقع ہونے والے ہر اختلاف میں آپ کو حاکم بنالیں پھر اس فیصلہ سے جو آپ صادر فرما دیں اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور (آپ کے حکم کو) بخوشی پوری فرمانبرداری کے ساتھ قبول کرلیں۔‘‘ (النساء، ۴: ۶۵)

اس آیت کریمہ میں بھی دل و جان اور شرحِ صدر کے ساتھ آقا علیہ السلام کے حکم اور حاکمیت کو واجب جاننے، اتھارٹی اور حجت ماننے اور آپ ﷺ کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا واضح حکم موجود ہے کہ حکمِ مصطفی ﷺ پر ایسے جھک جاؤ کہ انکار کی مجال نہ رہے۔

یہ چند آیات ہیں جو ایمان اور عقائد کے درست اور غلط ہونے کی پرکھ کے لیے پیمانہ ہیں۔ اسی طرح کے ڈیڑھ سو مقامات پر قرآن مجید یہی بات اسلوب بدل بدل کر کہہ رہا ہے اور پھر بھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم صرف قرآن مجید کو حجت مانتے ہیں۔ اگر یہ لوگ قرآن مجید کے احکام کو حجت مانتے تو قرآن مجید جس سنت

وحدیث اور اسوۂ وطرزِ حیات کو واجب قرار دے رہا ہے اور اپنی محبت کا ذریعہ بنا رہا ہے، اسے بھی اسوہ اور حجت مانتے۔ قرآن مجید کے ان صریح ارشادات کے بعد حجتِ سنت وحدیث کے انکار پر مبنی فتنے کی جڑ کٹ گئی۔ معلوم ہوا کہ محض یہ کہنا کہ ”صرف قرآن کافی ہے“، یہ گمراہی ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ ”قرآن و سنت کافی ہے اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم کافی ہے۔“ قرآن مجید کو سنت سے جدا کرنا کفر ہے۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ قرآن مجید کو سنت سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور سنت کو قرآن مجید سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

حضور علیہ السلام کی اطاعت، آپ ﷺ کے حکم کی حجیت اور آپ ﷺ کے حکم کا وجوب ہمارے اوپر اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا واجب ہے۔ صرف قرآن مجید کو حجت ماننا اور رسول کی حدیث وسنت کو حجت نہ ماننا، اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ ”میں لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ پڑھتا ہوں اور اسے حجت مانتا ہوں مگر مَحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو حجت نہیں مانتا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تک پہنچانا تھا، اللہ کی معرفت دینی تھی، توحید سے آشنا کروانا تھا اور شرک سے نکالنا تھا۔ ان کے ایسا کرنے کے بعد اب آپ ﷺ کی ضرورت نہیں رہی۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کا جو پیغام ہمیں انھوں نے دینا تھا، وہ دے گئے، یہی کافی ہے، اب ہمیں آپ ﷺ کی ضرورت نہیں ہے۔“ یاد رکھیں! ایسا کہنے والا کافر ہوگا۔ اس کو لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کبھی نفع نہیں دے گا، چونکہ دین اسلام کا کلمہ محض لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ نہیں ہے بلکہ کامل کلمہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مَحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے۔ جس طرح مَحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ سے جدا نہیں کر سکتے اور اس کے وجوب کا انکار نہیں کر سکتے اور فقط لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ پر اتفاق کر کے مومن و مسلمان نہیں ہو سکتے، اسی طرح حدیث وسنت اور سیرتِ رسول ﷺ کی حجیت واطاعت کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ کے فرمان اور قرآن مجید کی حجیت کو نہیں مان سکتے۔ ایسا کرنا کفر ہو جائے گا اور ایسا کرنا دین کو ٹکڑے کر دینا ہوگا۔ توحید پر عقیدہ رکھا مگر رسالت کا انکار کر دیا تو اس رویہ سے ایمان مکمل نہیں ہوا۔ توحید اور رسالت کو الگ نہیں کیا جاسکتا، ان کو جوڑیں گے تو عقیدہ بنے گا۔ اطاعتِ الٰہی اور اطاعت رسول۔۔۔ حجیتِ قرآن اور حجیتِ سنت۔۔۔ وجوبِ احکامِ قرآن اور وجوبِ احکامِ حدیث کو جوڑ کر اکٹھا مانیں گے تو صاحبِ ایمان ہوں گے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا ایک ساتھ ذکر حجیتِ حدیث وسنت کی دلیل ہے

یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن مجید نے تنہا ایمان باللہ کا ذکر نہیں کیا بلکہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کو اکٹھا رکھا ہے۔ یہیں سے اطاعت و حکمِ الٰہی اور اطاعت و حکمِ رسول ﷺ کے وجوب اور ان دونوں کو اکٹھا کرنے کا تصور نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ۔ (النساء، ۴: ۱۳۶)

”اے ایمان والو! تم اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (ﷺ) پر نازل فرمائی ہے۔“

اس آیت میں مخاطب مومن ہیں، کفار نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایک خطاب کفار کو ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ یہ خطاب انہیں کفر سے نکالنے کے لیے ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول دونوں پر ایمان لاؤ گئے تو کفر اور شرک سے نکلو گے لیکن مذکورہ آیت میں خطاب مومنین سے کیا جارہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا، اے ایمان والو! ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ جو پہلے ہی اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لا چکے، توحید و رسالت کی شہادت دے چکے، کفر و شرک سے نکل چکے اور مومن ہو چکے ہیں، انھیں ایمان لانے کا کہنا، کیا معنی رکھتا ہے؟ جو پہلی ہی ایمان لا چکے، اب اُن کے ایمان کو مضبوط کرنے کے لیے اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا کہ اے ایمان والو! کامل توکل اختیار کرو، تقویٰ کے پیکر بنو، اللہ کی بندگی اختیار کرو، مگر اللہ رب العزت نے یہ نہیں فرمایا بلکہ انھیں مومن بنا کر بھی ایمان باللہ اور ایمان بالرسول دونوں پر ایمان لانے کا کہا جارہا ہے اور فرمایا جارہا ہے کہ اے ایمان والو! تم ایمان والے نہیں رہو گے، اگر اللہ اور اُس کے رسول پر کامل ایمان نہیں لاؤ گے۔ پہلے ”ایمان والا بننے کے لیے“ کفر و شرک سے نکلنا ہوگا اور اللہ اور اُس کے رسول پر کامل ایمان لانا ہوگا اور پھر ”ایمان والا رہنے کے لیے“ ایمان لانے کے بعد اللہ اور اُس کے رسول کو کسی بھی مرحلہ پر جدا نہیں کرنا ہوگا۔

پھر فرمایا کہ: وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ یعنی اُس کتاب پر بھی ایمان لاؤ جو اللہ نے اپنے رسول پر اتاری۔ یہ نہیں کہا کہ جو اللہ نے اتاری بلکہ فرمایا کہ عَلٰی رَسُوْلِهٖ جو اس نے اپنے رسول پر اتاری ہے۔ یعنی اس کتاب کے قرآن ہونے کی شناخت بھی رسول نے دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید پر ایمان لانے سے پہلے رسول پر ایمان لانے کو مقدم رکھا۔

اسی بات کو ایک اور انداز میں سورۃ الفتح میں یوں ارشاد فرمایا:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا۔ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ۔

(الفتح، ۴۸: ۸، ۹)

”بے شک ہم نے آپ کو (روزِ قیامت گواہی دینے کے لیے اعمال و احوالِ امت کا) مشاہدہ فرمانے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ تاکہ (اے لوگو!) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور آپ (ﷺ کے دین) کی مدد کرو۔“

ان آیات سے واضح ہورہا ہے کہ پورا ایمان حضور علیہ السلام کی ذات کے ارد گرد گھومتا ہے۔ جس ذات کے فرمان کی حجیت کا انکار کیا جارہا ہے اور فتنے بپا کیے جارہے ہیں، اللہ نے ایمان کو ان ہی کی ذات اور شان و مقام

پر منحصر کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا اور ساتھ ہی اس امر کی تصریح بھی فرما دی کہ یہ شانیں کیوں عطا فرمائیں؟ تاکہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس رسول کی مدد کرو، اُس کے ہر حکم کو مانو، اُس کے دین کو سربلند کرو اور اس کی حد سے بڑھ کر عزت واحترام اور توقیر بجالاؤ۔ اُن کے کسی فرمان، شان، اطاعت، حکم، ادب اور اُن کے دین کی مدد کو کم نہ جانو۔

ایمان اور ہدایت اتباع رسول ﷺ کے ساتھ مشروط ہے

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (الاعراف، ۷: ۱۵۸)

”سو تم اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاؤ جو شانِ اُمیّت کا حامل نبی ہے جو اللہ پر اور اس کے (سارے نازل کردہ) کلاموں پر ایمان رکھتا ہے اور تم انہی کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاسکو۔“

اس آیت سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ قرآن مجید نے صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا کبھی کافی نہیں سمجھا۔ جب تک بندہ رسول پر ایمان نہ لائے، رسول پر ایمان لانے کے تقاضے پورے نہ ہوں تو اس کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اس لیے قرآن مجید اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اس کے رسول پر بھی ایمان لانے کا حکم دے رہا ہے۔

پھر واضح فرمادیا کہ کون سے نبی؟ فرمایا: اِلنَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وہ نبی جو دنیا کے کسی استاد سے پڑھ کر نہیں آئے بلکہ سب کچھ اللہ سے پڑھ کر آئے ہیں۔ اُن کا معلم فقط اللہ ہے۔ وہ پوری دنیا میں ہر صاحبِ علم سے بلند ہیں۔ وہ سب کے معلم اور رہبر ہیں۔ اُس نبی امی پر ایمان لاؤ جو اللہ کے تمام کلاموں کو مانتا اور اُن پر ایمان رکھتا ہے۔

پھر فرمایا: وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ اور ان کی اتّباع اور کامل پیروی کرو، اُن کی سنت طیبہ اور فرامین کے ہر ہر پہلو کو اپناؤ اور اُن کی زندگی کے ہر گوشے کو اسی طرح واجب جانو، جیسے اللہ تعالیٰ کا کلام قرآن مجید ہے۔ ایسا کرنے سے ہی تمہیں ہدایت نصیب ہو گی۔

اتباع کیا ہے؟ آقا علیہ السلام کے ہر حکم، ہر عمل، اسوۂ حسنہ اور حیات طیبہ کے جملہ اعمال واحوال اور اخلاق و فرامین کو واجب جاننے اور اپنانے کو اتباع کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے یہاں ہدایت کو حضور علیہ السلام کی اتباع، حدیث و سنت نبوی اور اسوۂ رسول کے واجب ہونے سے مشروط کر دیا کہ تم ہدایت نہیں پاسکتے اگر رسول کی اتباع نہیں کرو گے۔ پس ہدایت اتباعِ رسول ﷺ کے ساتھ

مشروط ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ اتباع رسول ﷺ کے بغیر ہدایت ممکن ہی نہیں ہے۔ جو اتباعِ رسول کو حجت اور واجب نہ جانے وہ ہدایت یافتہ نہیں بلکہ گمراہ ہے۔ ان تمام آیاتِ کریمہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کو یکجا کیا اور ایمان بالرسول میں اتباعِ رسول کو اس کا حصہ بنایا۔ اتباعِ رسول کے بغیر اگرچہ ایمان باللہ کا نعرہ بلند کرتے رہیں اور کلمہ پڑھتے رہیں مگر ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتے۔ جب تک محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع نہیں کریں گے، ہدایت مقدر نہیں بن سکتی۔

ایمان اور ذاتِ مصطفی ﷺ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان قرار دیا

قرآن مجید کا مطالعہ اس امر پر شاہد ہے کہ اللہ رب العزت نے دو چیزوں کا نام لے کر انھیں اپنی خاص نعمت قرار دیا ہے کہ یہ میرا احسان ہے۔ نعمتیں تو بے شمار ہیں، ہر عنایت اور ہر نعمت اللہ کی رحمت ہے، زندگی اللہ کی نعمت ہے، راحت اللہ کی نعمت ہے مگر اللہ رب العزت نے کسی بھی نعمت پر اپنا احسان نہیں جتلایا صرف دو نعمتوں کا نام لے کر فرمایا کہ یہ تم پر میرا احسان ہے:

۱۔ ایک چیز حضور علیہ السلام کی ولادت اور بعثت ہے، جس کے بارے میں فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا۔

”بے شک اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا کہ ان میں انہی میں سے (عظمت والا) رسول (ﷺ) بھیجا۔“ (آل عمران، ۳: ۱۶۴)

۲۔ دوسرے مقام پر 'ایمان' کو اللہ نے اپنا احسان قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

(الحجرات، ۴۹: ۱۷)

” یہ لوگ آپ پر احسان جتلاتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں۔ فرما دیجیے: تم اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ جتلاؤ بلکہ اللہ تم پر احسان فرماتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کا راستہ دکھایا ہے، بشرطیکہ تم (ایمان میں) سچے ہو۔“

گویا حضور علیہ السلام کے وجودِ مسعود، آپ کی ولادت مبارکہ، آپ کی بعثت طیبہ، آپ کے بطورِ نبی دنیا میں تشریف لانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا احسانِ عظیم کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس ہستی کو دنیا میں مبعوث کرنا اپنا احسان قرار دے، اگر اس ہستی کو حجت نہ مانا جائے تو پھر ایمان کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔

(جاری ہے)

آپ کے فقہی مسائل

اسلام آسانیاں عطا کرنے والا دین ہے

دارالافتاء تحریک منہاج القرآن، زیر نگرانی: مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی

سوال: کسی بھی کام کے نہ کرنے پر شرعی دلیل مانگی جاتی ہے۔ اس کی وضاحت فرما دیں؟

جواب: اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے دینی و دنیوی لحاظ سے زندگی کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اسلام نے رہنمائی نہ کی ہو۔ اشیاء کی تحلیل و تحریم (حلال و حرام قرار دینا) کے حوالے سے اسلام نے جو اصول تشریع مقرر کئے ہیں ان میں پہلا اصول یہ مقرر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیداکردہ تمام چیزیں مباح ہیں۔ حرام اور واجب صرف وہ چیزیں ہیں جن کی حرمت یا وجوب کے بارے میں صحیح اور صریح نص وارد ہو چکی ہو، اگر کسی شئے کی حرمت و وجوب کے حوالے سے صحیح اور صریح نص نہ پائی جاتی ہو تو وہ چیز مباح تصور کی جائے گی۔ یہ اصول صرف اسلام کے نظام قانون کا ہی اصول نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام نظام قانون کا ایک بنیادی اصول ہے کہ اشیاء و افعال اپنی اصل کے اعتبار سے مباح اور جائز ہیں، پھر ان اشیاء میں سے جو لازمی طورپر مطلوب یا ممنوع ہوتی ہیں خود ان کو یا ان کی علت کو نصوص میں بیان کر دیا جاتا ہے ان کے علاوہ باقی اشیاء کو مباح کے طورپر مطلق چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایسی مباح

اشیاء کے کرنے یا نہ کرنے بارے میں لوگوں کو آزادی اوراختیار ہوتا ہے،اور ان کے کرنے یا نہ کرنے پر قانونی لحاظ سے کوئی مواخذہ نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ قوانین کی تشکیل میں کہیں بھی مباح امور کا احاطہ نہیں کیا جاتا بلکہ صرف لازمی وحرام امور کا احاطہ کیاجاتا ہے۔

اسلام آسان دین ہے، قدم قدم پر بنی نوع انسان کو آسانیاں اور سہولتیں عطا کرتا ہے اس کے قانون سازی کے اصولوں میں قلتِ تکلیف ایک بنیادی اصول ہے۔ یہی وجہ ہے اس میں محرمات و واجبات کا دائرہ مباح اور جائز امور کے مقابلے میں تنگ اور محدود ہے، کیونکہ محرمات اور واجبات وہ امور ہوتے ہیں جن کا انسان لازمی طور پر پابند ہوتا ہے۔ فطری طور پر انسان چونکہ آزاد منش پیدا ہوا ہے، زیادہ پابندیوں سے کتراتا ہے اور آسانیوں کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے واجبات و ممنوعات کے احکام کا غیر ضروری بوجھ انسان پر نہیں ڈالا بلکہ چند محدود اشیاء و امور جن کا کرنا یا نہ کرنا انسان کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے نہایت ضروری تھا کا پابند ٹھہرایا اور باقی اشیاء کو انسانی اختیار پر چھوڑتے ہوئے مباح قرار دے دیا ہے۔یعنی اسلام کے مطابق زمین و آسمان کی تمام اشیاء بنی نوع انسان کے انتفاع کے لئے تخلیق کی گئی ہیں جس کا تقاضہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام اشیاء مباح الاصل ہوں سوائے ان اشیاء کے جن کے کرنے یا نہ کرنے کا انسان کو پابند ٹھہرایا گیا ہے۔اس تصور کو نظریہ اباحت اصلیہ کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

نظریہ اباحت اصلیہ کو اصول فقہ اور قواعدفقہ کی کتابوں میں درج ذیل الفاظ سے بیان کیا گیا ہے:

الأصل فى الأشياء الإباحة.

”اشیاء میں اصل جواز (جائز ہونا) ہے۔“

(ابن عبد البر، التمهيد، ۴: ۱۴۳، ۶۷)

اگر ہم روز مرہ زندگی میں بھی دیکھیں تو یہی قاعدہ قابل عمل ہے ورنہ تو انسان کے لئے زندگی کا ہر ہر قدم مشکل بن کر رہ جائے۔ مثلاً ہم گھر سے نکلیں تو گلیوں، بازاروں اور سڑکوں پر یہ لکھا ہوا تلاش کرنا شروع کر دیں کہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ ہم یہاں سے گزر سکتے ہیں۔ ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ہاں کہیں کہیں یہ لکھا ہوا ضرور

مل جائے گا کہ یہ راستہ فلاں مقام کی طرف جا رہا ہے یا پھر یہ الفاظ اور علامات ملیں گی کہ یہ شارع عام نہیں ہے، No entry، یہاں غیر متعلقہ افراد کا داخلہ بند ہے، بغیر اجازت اندر آنا منع ہے وغیرہ وغیرہ یا پھر گیٹ یا کسی بھی رکاوٹ سے راستہ بند کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ہر اس راستے سے گزرنے کی اجازت ہوتی ہے جہاں ممانعت کا کوئی نشان نہ پایا جائے۔ لہٰذا شریعت میں بھی کسی کام کے نہ کرنے کے لئے ممانعت کی دلیل ہونا ضروری ہے۔

سوال: اگر کسی شے کو حرام قرار دینا ہو تو اس کے لیے کن شرائط کا ہونا ضروری ہے؟

جواب: حرام کا لغوی معنی ممنوع، ناجائز اور روک دیا جانا ہے، ایسا فعل جس سے روکنا مقصود ہوتا ہے اس کو حرام کہا جاتا ہے۔ (ابراهیم مصطفى، المعجم الوسیط، ۱: ۱۶۹)

امام غزالی نے حرام کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

اَلْحَرَامُ هُوَ الْمَقُوْلُ فِيْهِ: أُتْرُكُوْهُ وَلَا تَفْعَلُوْهُ.

(غزالی، المستصفى، ۱: ۴۵)

حرام وہ شے یا فعل ہے جس کے بارے میں ترک کر دینے اور نہ کرنے کا صریح حکم آیا ہو۔

شیخ وہبہ زحیلی نے حرام کی تعریف اس طرح کی ہے:

اَلْحَرَامُ مَا طَلَبَ الشَّارِعُ تَرْكَهُ عَلَى وَجْهِ الْحَتْمِ وَالْإِلْزَامِ.

حرام وہ فعل ہے جس کو شارع نے حتمی اور لازمی طور پر ترک کرنے کا مطالبہ کیا ہو۔ (وهبة الزحيلي، أصول الفقه، ۱: ۸۰)

شریعت میں حرام اشیاء کو صرف ان کے مَفاسد اور خرابیوں کی وجہ سے حرام کیا گیا ہے، یہ فساد یا تو فعل کی ذات میں ہوتا ہے یا کسی خارجی امر کے ملنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر حرام کی دو اقسام ہیں:

حرام لذاتہ　　　　حرام لغیرہ

حرام لذاتہ وہ حرام ہے، جسے شارع نے اس کے ذاتی ضرر اور مفاسد کی وجہ سے حرام کیا ہے۔ ایسے ضرر اور مفاسد جو کسی حال میں بھی اس سے جدا نہ ہوتے ہوں۔ مثلاً زنا، چوری، قتل، شراب نوشی اور ایسے ہی دوسرے اُمور جو ذاتی طور پر حرام ہیں کیونکہ ان کے مفاسد ہمیشہ برقرار رہتے ہیں، کبھی مرتفع، معطل یا معدوم نہیں ہوتے۔

حرام لغیرہ وہ حرام ہے، جو اپنی اصل ذات کے اعتبار سے مشروع ہو، کیونکہ اس میں کوئی ضرر اور فساد نہیں ہوتا ہے، یا اس کی منفعت غالب ہوتی ہے، مگر اس کے ساتھ کوئی ایسی چیز مل گئی ہو، جو اس کے حرام ہونے کا تقاضا کرے۔

مثلاً غصب شدہ زمین پر نماز پڑھنا، جمعہ کی آذان کے بعد بیع کرنا، عیدین کے دن روزے رکھنا، حرام ہیں، مگر اپنی اصل کے اعتبار سے حرام نہیں، بلکہ نماز، بیع اور روزہ اپنی اصل کے اعتبار سے مشروع اعمال ہیں، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، مگر بالترتیب مغصوبہ زمین، آذان ہو جانے اور عیدین کے ایام کی وجہ سے حرام ہو گئے ہیں۔اس لیے اس حرمت کو 'حرمت لغیرہ' اور عمل کو 'حرام لغیرہ' کہا جائے گا کیونکہ کسی اور خارجی سبب نے فی نفسہ کسی جائز عمل کو حرام بنا دیا۔لہٰذا یہ 'حرمت مؤقت اور عارضی' ہوتی ہے۔

حرام کے ثبوت کے ذرائع

حرام کے ثبوت کے درج ذیل پانچ ذرائع ہیں:

(۱) لفظِ حرام اور اس کے مشتقات

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔

’’تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری (وہ) مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو اور تمہاری رضاعت میں شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں (سب) حرام کر دی گئی ہیں اور (اسی طرح) تمہاری گود میں پرورش پانے والی وہ لڑکیاں جو تمہاری ان عورتوں (کے بطن) سے ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو (بھی حرام ہیں) پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر (ان کی لڑکیوں سے نکاح کرنے میں) کوئی حرج نہیں اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں (بھی تم پر حرام ہیں) جو تمہاری پشت سے ہیں اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ (نکاح میں) جمع کرو سوائے اس کے کہ جو دورِ جہالت میں گزر چکا۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘ (النساء ۴: ۲۳)

حُرِّمَتْ (حرام کر دی گئی ہیں) کا لفظ آیت میں مذکورہ عورتوں کے ساتھ نکاح کے حرام ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

(۲) نفیِ حلت

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ م بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔

’’پھر اگر اس نے (تیسری مرتبہ) طلاق دے دی تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہ ہو گی یہاں تک کہ وہ کسی اور شوہر سے نکاح کرے۔‘‘ (البقرہ، ۲: ۲۳۰)

اسی طرح حدیثِ مبارک میں ہے:

لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِنْهُ.

(أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۷۲، رقم: ۲۰۷۱۴)

ایک مسلمان کا مال دوسرے مسلمان کے لیے دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

مندرجہ بالا نصوص میں فَلَاتَحِلُّ اور لَایَحِلُّ کے الفاظ حلال ہونے کی نفی کر رہے ہیں۔ اس لیے تیسری طلاق کے بعد بغیر حلالہ کے بیوی حرام ہے اور کسی مسلمان کی مرضی کے بغیر اس کا مال کھانا بھی حرام ہے۔

(۳) صیغہ نہی

ایسا صیغہ نہی جو ایسے قرینہ سے خالی ہو، جو اس کو حرمت سے پھیر دے۔ جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ۔ (الاسراء، ۱۷: ۳۱)

اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل مت کرو۔

یہاں لَاتَقْتَلُوْا (قتل مت کرو) صیغہ نہی ہے، جس سے فعل کا حرام ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

(۴) لفظِ اجتناب

ارشادِ فرمایا:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ

سو تم بتوں کی پلیدی سے بچا کرو اور جھوٹی بات سے پرہیز کیا کرو۔ (الحج، ۲۲: ۳۰)

اس آیت میں فَاجْتَنِبُوْا (پس تم پرہیز کرو) کے لفظ سے بتوں کی پلیدی اور جھوٹ کا حرام ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

(۵) عقوبت کا تعین

وہ کام جس پر دنیوی یا اخروی سزا کا بیان ہو، وہ حرام ہے۔ مثلاً:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً۔ (النور، ۲۴: ۴)

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر (بدکاری کی) تہمت لگائیں پھر چار گواہ پیش نہ کر سکیں، تو تم انہیں (سزائے قذف کے طور پر) اَسّی (80) کوڑے لگاؤ۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔ (النساء، ۴: ۱۰)

بے شک جو لوگ یتیموں کے مال ناحق طریقے سے کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں (صرف) آگ بھرتے ہیں اور وہ جلد ہی دہکتی ہوئی آگ میں جا گریں گے۔

مذکورہ بالا آیات میں چونکہ جھوٹی تہمت لگانے پر اَسی (80) کوڑے مارنے کا حکم ہے، جو کہ دنیوی سزا ہے اور یتیموں کے مال کھانے والوں کے لیے جہنم کی آگ کی وعید ہے، جو کہ اُخروی سزا ہے۔ چونکہ ان دونوں اَفعال پر سزا کا بیان ہے، اس لیے یہ اور اس قسم کے باقی اَفعال حرام ہوں گے۔

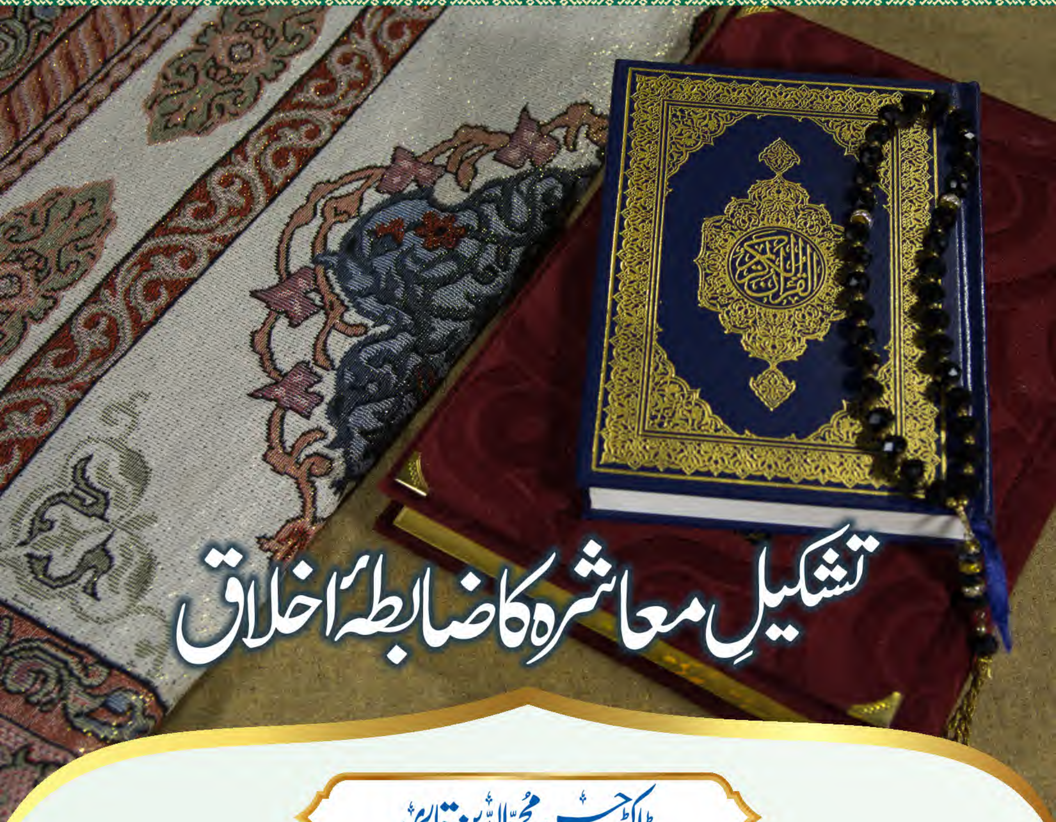

تشکیلِ معاشرہ کا ضابطۂ اخلاق

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری

ہر شعبہ زندگی کے کچھ ضابطۂ اخلاق، اقدار اور خوبیاں ہوتی ہیں، جن سے وہ شعبہ خوبصورت اور باوقار ہوتا ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ انسان اپنے نام سے نہیں جانا جاتا بلکہ اس کا نام اس کے کردار سے جانا جاتا ہے اور یہ کردار اُسے کسی نسبت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ حقوق العباد سے تعلق رکھنے والا ہر شعبہ خدمتِ دین کے باب میں ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔اس خدمت سے انسان اللہ تعالیٰ کے قریب بھی ہو سکتا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کو کماحقہ سرانجام نہ دینے کے سبب اللہ تعالیٰ سے دور بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ ہر بندہ اپنے اپنے شعبہ میں خدمتِ انسانیت کے سبب قربت و معیتِ الٰہی سے بھی ہمکنار ہو سکتا ہے اور جہنم کا بھی حقدار بن سکتا ہے۔اس کا دار و مدار انسان کی اُن اخلاقیات اور طرزِ عمل سے ہے جس کی رہنمائی وہ قرآن اور حدیث سے لمحہ بہ لمحہ لے رہا ہوتا ہے۔

دنیا میں سبقت لے جانے کا چیلنج ہر شخص کو درپیش ہے لیکن کبھی دنیا کو دیکھ کر اپنے کردار کی تشکیل نہ کریں۔ جو دنیا کو دیکھ کر اپنا کردار تشکیل دیتے ہیں، وہ بے کردار ہو جاتے ہیں۔اس کے برعکس جو مولا کے عطا کردہ راستوں پر چلتے ہوئے اپنی کردار سازی کرتے ہیں تو پوری دنیا ان کے کردار کی معترف ہو جاتی ہے۔

یاد رکھیں! زمانہ شخصیات پیدا نہیں کرتا بلکہ شخصیات زمانہ بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت کی ان محبوب ہستیوں کے نام سے زمانے یاد کیے جاتے ہیں جن کے وجود سے زمانے منور اور مہک رہے ہیں۔ ان ہستیوں کے زمانوں کو ان کی وجہ سے عزت و فضیلت نصیب ہوئی۔ مثلاً: یہ کہا جاتا ہے کہ آقا علیہ السلام کا زمانہ، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانہ، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا زمانہ، امام حسن و حسین علیہما السلام کا زمانہ، امام اعظم ابو حنیفہ کا زمانہ، امام شافعی کا زمانہ، امام احمد بن حنبل کا زمانہ، امام بخاری و مسلم کا زمانہ، حضور داتا علی ہجویریؒ کا زمانہ وغیرہ۔

صرف اتنا ہے کہ ان شخصیات کے وجود ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں مگر ان کی مہک صدیوں تک ماحول اور زمانے کو معطر کرتی رہتی ہے۔ ایسی شخصیات کا وجود تو نظر نہیں آتا مگر ان کی روح ہر زمانے میں زندہ رہتی ہے اور ان کی مہک زمانے کو تر و تازہ رکھتی ہے۔ یہ روحانی مہک دراصل ان شخصیات کے اخلاق، اعلیٰ اقدار، طرزِ عمل اور طرزِ زندگی ہے۔

ایک اعلیٰ معاشرہ کی تشکیل میں ہر شعبۂ زندگی کے لیے ایک ایسا ہی ضابطۂ اخلاق ناگزیر ہے جو قرآن و حدیث کی تعلیمات میں موجود ہے اور جس پر عمل پیرا ہو کر ہمارے اسلاف نے نہ صرف اپنے زمانے کی اصلاح فرمائی بلکہ اُن کے کردار کی روشنی سے آج بھی زمانہ منور ہے۔ اس ضابطۂ اخلاق پر عمل درآمد میں ہی اس معاشرہ کی بقا کا راز مضمر ہے۔ ذیل میں ایک اعلیٰ معاشرہ کی تشکیل کے لیے درکار ضابطۂ اخلاق کے کچھ نکات درج کیے جاتے ہیں:

ا۔ زبان کی حفاظت

تشکیل معاشرہ کا پہلا ضابطہ زبان کی حفاظت ہے۔ یعنی زبان کا اچھا یا برا استعمال افراد اور معاشرے کے کردار کی خبر دیتا ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص اپنے اندر 9 خوبیاں رکھتا ہے لیکن ایک ایسی خامی ہے جو ان 9 خوبیوں پر حاوی ہو جائے تو ان 9 خوبیوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس ایک خامی کی وجہ سے سب کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔ یعنی 9 خوبیاں تو ہم اپنی شخصیت میں رکھتے ہیں، اچھے امور بھی سرانجام دیتے ہیں مگر یہ ایک ایسی خامی ہے جو 9 پر غالب آجاتی ہے۔ پوچھا گیا کہ وہ کون سی خامی ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

فاتقوا اثرات اللسان۔ آفاتِ زبان سے بچا کرو۔

یہ زبان ہے جو بچاتی بھی ہے اور مرواتی بھی ہے۔۔۔ جنت میں بھی لے جاتی ہے اور دوزخ میں بھی گراتی ہے۔ ہم زندگی میں اچھے کام کرتے کرتے زبان سے کوئی ایسا غلط کلام کر بیٹھتے ہیں کہ پچھلے

تمام اچھے کاموں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ زبان کا غلط استعمال اور بدکلامی ایسی بداخلاقی ہے جس نے اس معاشرے کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ مثلاً: کسی غریب کی مدد کرتے کرتے آخر میں ایسی طنز کی بات کر دیتے ہیں جس سے اس غریب کی عزت جاتی رہتی ہے اور وہ خود کو حقیر محسوس کرنے لگتا ہے۔ یا نیک اعمال کرتے کرتے یہ کلمات بول دیتے ہیں کہ ’’تمہیں پتہ ہے کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے اور میری کاوشوں کا نتیجہ ہے‘‘ بس یہ کہنے کی دیر ہوتی ہے کہ ہم فوراً اللہ کی نگاہ میں گر جاتے ہیں۔

ہمارا کسی دوسرے کو کسی تعاون یا کام کے سلسلہ میں اقرار یا انکار کرنے کا عمل بھی نہایت تلخی پر مبنی ہوتا ہے۔ ہم انکار بھی ترش اور تلخ انداز میں کرتے ہیں اور اگر بالفرض اس کے ساتھ تعاون کرنا بھی ہو تو ایسے طریقے سے جواب دیتے ہیں کہ دوسرا بندہ شرمندہ ہو جاتا ہے۔ گویا اس بندے کو شرمندگی کے عمل سے گزار کر پھر اس کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا کام بھی کر دیتے ہیں۔ ایسی نیکی اور بھلائی کس کام کی جب زبان پر تلخی اور دل میں تنگی موجود ہو۔ یاد رکھیں کہ کبھی کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں، ایسا کرنا انسان کو دنیا و آخرت میں رسوا کر دیتا ہے۔

۲۔ امانت داری

اعلیٰ معاشرہ کی تشکیل کا دوسرا ضابطہ امانت داری ہے۔ امانت داری انسان کے ماتھے کا جھومر ہے۔ ہم جس بھی شعبہ سے وابستہ ہیں، اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیشہ امانت کا دامن تھامے رکھیں کیونکہ اسی امانت و دیانت پر عدل و انصاف کی عمارت استوار ہوتی ہے اور عدل و انصاف پر ہی کامیاب معاشرے کی عمارت کا ڈھانچہ قائم کیا جاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا۔ (النساء، ۴: ۵۸)

’’بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُنہی لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں۔‘‘

اس آیت کا مطلب صرف یہاں تک محدود نہیں کہ کسی نے امانتاً کوئی چیز یا مال و دولت دیا اور ہم نے اس تک پہنچا دیا جس کے لیے دیا گیا تھا، نہیں بلکہ ہر میدان اور شعبہ میں امانت کا ایک پہلو موجود ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ۔

(مسند احمد بن حنبل، ۳: ۱۳۵، الرقم: ۱۲۴۰۶)

اس کا ایمان ہی نہیں جس میں امانت نہ ہو۔

گویا امانت میں خیانت کرنا بے ایمان ہونے کی علامت ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم دن رات کیا

کرتے ہیں۔ اگر مال و دولت اور عہدہ و منصب کی خاطر اپنا ایمان بیچ دیں تو دنیا تو گزر جائے گی لیکن سوال یہ ہے کہ قبر اور آخرت کے معاملات کا کیا بنے گا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ۔

(سنن ابوداؤد، کتاب الاجارہ، ۳: ۲۹۰، الرقم: ۳۵۳۵)

جس کسی نے تیرے پاس امانت رکھی ہو تم اسے امانت واپس کر دو اور جس نے تیرے ساتھ خیانت کی تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔

امانت کی ادائیگی کے حوالے سے اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نے قبر کی فکر کرنی ہے یا دنیا کی فکر کرنی ہے؟ یاد رکھیں! دنیا کی کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہیں ہے۔ لہٰذا امانت کے حوالے سے ہمیشہ اللہ کی رضا اور اس کے احکامات مقدم رہنے چاہئیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھجور وغیرہ کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی پر لیٹے، اس سے آپ کے پہلو پر نشان پڑ گئے، جب آپ بیدار ہوئے تو میں نے آپ کے پہلو پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیے اور کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں کیوں نہیں بتلایا، ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے چٹائی پر) کوئی گدا وغیرہ (بچھا دیتے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَا لِي وَلِلدُّنْيَا مَا مَثَلِي وَمَثَلُ الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ سَارَ فِي يَوْمٍ صَائِفٍ فَاسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا. (مسند احمد بن حنبل، ۶: ۱۴۰، الرقم: ۲۶۰۸)

”میرا دنیا سے کیا تعلق ہے؟ میری دنیا سے کیا نسبت ہے؟ میری اور دنیا کی مثال اس سوار کی طرح ہے جو ستانے کے لیے کسی درخت کے سائے میں چند لمحوں کے لیے بیٹھا اور پھر اسے ترک کرکے چل دیا۔“

گویا یہ دنیا ایسے ہی ہے کہ جیسے سفر کے دوران کسی درخت کے سائے تلے ستانا۔ اس کے بعد دوبارہ سفر شروع ہو جاتا ہے جو تھوڑی دیر کا سایہ ملا ہے، یہ دنیا ہے لیکن سفر تو جاری ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا كَمِثْلِ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ هَذِهِ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَا يَرْجِعُ۔

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنی ایک انگلی سمندر میں ڈالے، پھر دیکھے وہ انگلی اس میں سے کیا نکال کر لاتی ہے۔

(احمد بن حنبل المسند، ۴: ۲۲۸، الرقم: ۱۸۰۳۷)

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

لَا تَنْظُرُوا إِلَى صَلَاةِ أَحَدٍ وَلَا إِلَى صِيَامِهِ وَلَكِنِ انْظُرُوا إِلَى مَنْ إِذَا حَدَّثَ صَدَقَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ أَدَّى۔
(سنن الکبری، البیہقی، ج ٦، ص ٢٨٨، الرقم: ١٢٤٧٣)

کسی شخص کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنی ہو کہ یہ کیسا ہے؟ ساتھ نبھانے والا ہے، وفادار ہے یا راستے میں ہی چھوڑ دینے والا ہے؟ تو صرف یہ دیکھ کر فیصلہ نہ کیا کرو کہ وہ نماز و روزہ کی پابندی کرنے والا ہے بلکہ یہ دیکھا کرو کہ جب بولے سچ بولے، جب امانت سونپ دی جائے تو ادا کرنے والا بن جائے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ''امانت'' نبوی اوصاف میں سے ایک اہم وصف ہے۔ پس ہم جس بھی شعبہ زندگی سے تعلق رکھتے ہوں ہمارے لیے حضور علیہ السلام کے اس وصف کو اپنے اندر پیدا کرنا ناگزیر ہے، افراد کے اسی کردار سے ایک اعلیٰ معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

٣۔ صداقت

تشکیل معاشرہ میں تیسرا اہم ترین ضابطۂ اخلاق صداقت اور سچائی ہے۔ کبھی سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ معاشرے کے تمام میادین سچ پر قائم ہو جائیں تو وہ معاشرہ خیر پر استوار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اپنی ان بداخلاقیوں اور اسلامی اقدار و تعلیمات پر عمل نہ کرنے کے سبب ضعفِ ایمان کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس میں خیر ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ایک ذلت بھری زندگی ہے۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑ جاتے ہیں۔ دوسری طرف سچ کا بولنا انسان کو کئی مصائب اور شرمندگی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔

'' اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اہلِ صدق (کی معیت) میں شامل رہو۔'' (التوبۃ، ٩: ١١٩)

اللہ تعالیٰ نے ایک مومن کے لیے نجات کا راستہ دو امور میں پنہاں رکھا ہے: اللہ سے ڈرتے رہنا اور سچے لوگوں کی صحبت و معیت کو اختیار کرنا۔ سیدنا عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتَّى يَكُونَ صِدِّيقًا وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّابًا. (بخاری الصحیح، ج ٥، ص ٢٢٦١، الرقم: ٥٧٤٣)

”تم صدق پر قائم رہو کیونکہ صدق نیکی کے راستے پر چلاتا ہے اور نیکی جنت کے راستے پر چلاتی ہے۔ انسان مسلسل سچ بولتا رہتا ہے اور کوشش سے سچ پر قائم رہتا ہے، حتی کہ وہ اللہ کے ہاں صدیق لکھ لیا جاتا ہے اور جھوٹ سے دور رہو کیونکہ جھوٹ کج روی کے راستے پر چلاتا ہے اور کج روی آگ کی طرف لے جاتی ہے، انسان مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کا قصد کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسے کذاب لکھ لیا جاتا ہے۔

حضرت اسماعیل بن عبید بن رفاعہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میرے دادا آقا علیہ السلام کے ساتھ باہر تشریف لے گئے اور عید گاہ کی طرف جا رہے تھے کہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ لین دین میں مصروف ہیں، خرید و فروخت ہو رہی ہے اور منڈی لگی ہوئی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ رک گئے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ فَاسْتَجَابُوا لِرَسُولِ اللهِ ﷺ وَرَفَعُوا أَعْنَاقَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ إِلَيْهِ فَقَالَ إِنَّ التُّجَّارَ يُبْعَثُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا إِلَّا مَنِ اتَّقَى اللهَ وَبَرَّ وَصَدَقَ۔

(سنن الترمذی، کتاب البیوع، ۳: ۵۱۵، الرقم: ۱۲۱۰)

اے تاجرو میری بات سنو۔ تمام تاجر حضور ﷺ کی طرف متوجہ ہو گئے تو آپ نے فرمایا: قیامت کے روز سوائے تین کے تمام تاجر لوگ نافرمانوں میں شمار ہوں گے۔ جس نے خدا کا تقویٰ اختیار کیا اور اس سے ڈرتا رہا، جو نیکی کا دامن تھامے رہا اور جو سچ بولتا رہا۔

معلوم ہوا جو ہر قدم پر خدا سے ڈرتا رہے، نیکی کے امور سرانجام دیتا رہے اور سچائی پر کاربند رہے تو صرف وہی نافرمانوں کی فہرست سے نکلے گا۔

۴۔ قناعت

قناعت اور عدمِ طمع معاشرہ کی تشکیل کے لیے درکار ضابطۂ اخلاق میں سے ایک اہم ترین ضابطہ ہے۔ بلا حدود و قیود دنیا کی طلب میں مارا مارا پھرنا لالچ، حرص اور ہوس ہے اور جہاں مادیت کے حصول کی اس دوڑ پر حد لگا دیں، وہ قناعت ہے۔ قیامت والے دن دوزخ پکارے گی: ھل من مزید ھل من مزید کوئی ہے جو میرے لپیٹ میں مزید آجائے، میں ابھی بھری نہیں۔ افسوس کہ ہم بھی اس دنیا میں ھل من مزید کا ورد کر رہے ہیں اور ہماری حرص و ہوس اور لالچ ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آقا علیہ السلام نے فرمایا:

لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ۔

(صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، ۲: ۷۲۶، الرقم: ۱۰۵۱)

غناء کثرت مال کا نام نہیں ہے بلکہ دل کی بے نیازی کا نام ہے۔

امیری یہ ہے کہ دل دنیا سے بے نیاز ہو جائے۔ دل ہر حال میں مطمئن رہے اور کہے کہ دینے والا بھی وہی ہے اور لینے والا بھی وہی ہے۔ سائیکل پر بٹھایا تھا تو تب بھی اسی نے دیا تھا، آج لینڈ کروزر پر ہوں تو اسی نے دیا۔ جب دل ہر حال میں اللہ سے خوش ہو تو یہ بے نیازی ہے۔ جب دل ہر حال میں اللہ سے خوش اور مطمئن ہو جائے تو اسی کو امارت کہتے ہیں۔

ہم دن رات دنیا کمانے میں مصروف رہتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ اس طریق پر بالآخر ہمارا دل مطمئن ہو جائے گا۔ حالانکہ صورت حال اس کے برعکس ہوتی ہے اور جتنا مال بڑھتا جاتا ہے، دل مطمئن ہونے کے بجائے گھبراتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے کہ جتنا مال بڑھے گا، اس کو بچانے کی فکر بھی اتنی ہی زیادہ لاحق ہو گی اور اس فکر کے نتیجے میں دل کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گا۔ جس نے ناجائز ذرائع سے مال لیا ہو گا اسے یہ گھبراہٹ رہے گی کہ کہیں میرا مال کم نہ ہو جائے۔ پس مال کا بڑھنا امارت نہ بنا، اس لیے کہ امارت تو دل کے سکون کا نام تھا اور ایسا دل کا سکون آقا علیہ السلام کی نسبت سے ملتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت یہ ہے کہ کئی کئی دن ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیت اطہار کے ہاں چولہا تک نہ جلتا تھا اور محض کھجور اور پانی پر گزر بسر ہوتا تھا اور اس حال میں بھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ اقدس اطمینان کی روشنی سے کائنات کو چمکا رہا ہوتا۔

پس قناعت ایک نعمتِ عظمیٰ ہے، اس پر کاربند ہو کر ہم اپنے معاشرہ کو جنت نظیر معاشرہ بنا سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارا بحران ھل من مزید ہے۔ انسان ناشکرا ہے، ناقانع اور نامطمئن ہے۔ وہ رکتا نہیں، بس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یاد رکھیں جو مال بڑھ رہا ہوتا ہے، اس کا حساب بھی دینا ہوتا ہے۔ اس دولت کا کیا کرنا جو دوزخ کے عذاب کا ذریعہ بن جائے۔ اس سے بہتر تھا کہ بندہ ایک جھونپڑی میں رہتا، اللہ کا ذکر کرتا، اس کی مخلوق کی خدمت کرتا اور جو مالک عزت سے دے دیتا اس پر راضی رہتا، قانع اور شاکر رہتا، دل کا امیر ہوتا اور مطمئن رہتا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَرُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللهُ بِمَا آتَاهُ۔

(صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، ۲: ۷۳۰، رقم: ۱۰۵۴)

”کامیاب ہوا وہ شخص جس نے اسلام قبول کیا اور بقدر ضرورت اسے روزی حاصل ہوئی اور اللہ نے اسے اپنے دیئے ہوئے پر قناعت کرنے والا بنا دیا“

یعنی جسے آج کے دور میں جو بھی نعمتیں مل جائیں اسی پر مطمئن ہو جائے کہ اسے اور کچھ نہیں چاہیے۔ یاد رکھیں کہ دنیا میں ہر کسی کو اس کے حصے کا رزق ضرور ملے گا لیکن اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اسے ذلیل ہو کر پانا چاہتا ہے یا عزت کے ساتھ؟ دونوں صورتوں میں رزق اسے ملے گا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

طُوبَى لِمَنْ هُدِيَ إِلَى الْإِسْلَامِ وَكَانَ عَيْشُهُ كَفَافًا وَقَنَعَ۔

(سنن الترمذی، کتاب الزہد، ۴: ۵۷۶، رقم: ۲۳۴۹)

"خوشخبری ہے اس کے لیے جسے اسلام کی طرف سے ہدایت مل گئی اور بقدرِ ضرورت روزی مل گئی اور وہ قناعت کرنے والا بن گیا۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اَلْقَنَاعَةُ وَهِيَ كَنْزٌ لَا يَفْنَى۔

(الزھد الکبیر، البیہقی، ص: ۸۸، رقم: ۱۰۴)

قناعت وہ خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہو گا۔

قناعت "بس" کا نام ہے کہ گھر کے اخراجات اور بچوں کی روزی روٹی عزت کے ساتھ پوری ہو جائے تو انسان کہے بس بہت ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں:

القناعة تورث الراحة۔ (الطبقات الکبریٰ، ص: ۷۹)

قناعت راحت کا دروازہ کھولتی ہے۔

۵۔ رزقِ حلال

تشکیلِ معاشرہ کے ضابطۂ اخلاق کا پانچواں نکتہ "رزقِ حلال" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔ (البقرہ، ۲: ۱۶۸)

"اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال اور پاکیزہ ہے کھاؤ، اور شیطان کے راستوں پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

شیطان کے راستے پر نہ چلنے کا حکم اس لیے دیا کہ شیطان ھل من مزید کی طرف لے جاتا ہے۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی:

اے بیٹے! کسب حلال کے ذریعے غربت سے بچو۔ اس لیے کہ جس شخص کو غربت لاحق ہوتی

ہے، اسے تین باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

۱۔ اس کے دین میں کمزوری آجاتی ہے۔

۲۔ اس کے اندر سے خودداری چلی جاتی ہے۔

۳۔ اس کی عقل پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے۔

پس اس غربت سے بچیں کہ جس سے خودداری بھی چلی جائے اور دین کی غیرت و حمیت میں بھی کمی آجائے۔ حلال کمائیں تاکہ دین کی غیرت و حمیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے اور خودداری بڑھتی جائے۔ کبھی رزقِ حرام کے سبب اپنی غیرت کا سودا نہ کریں۔ اگر حلال کمائی کو اپنی زندگی میں رائج کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی کے آگے آنکھیں اور سر نہیں جھکے گا۔ حلال کمائیں گے تو عقل بھی سلامت رہے گی۔ اس لیے کہ حلال کی کمائی عقل کو مضبوط کرتی ہے، خودداری میں اضافہ کرتی ہے اور دین میں مضبوطی و استحکام دیتی ہے۔ جس کی کمائی حلال ہوگی، دنیا میں اس کا سر کوئی جھکا نہیں سکتا۔

۶۔ رحمت و محبت اور صلح جوئی

تشکیل معاشرہ کے ضابطہ اخلاق کا چھٹا اہم نکتہ رحمت و محبت اور صلح جوئی کا فروغ ہے۔ آج معاشرے میں ہمارا طرزِ عمل اور رویہ یہ ہے کہ ہم کسی کی معاشرتی حیثیت دیکھ کر اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنے یا نہ کرنے کا قدم اٹھاتے ہیں۔ انسان خواہ کسی بھی شعبہ زندگی سے تعلق رکھتا ہو، وہ ہر ایک کے ساتھ بلا تفریقِ مذہب، نسل، مالی حیثیت پیار و محبت سے پیش آئے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے یہ تعلیم نہیں دی کہ بندے کی حیثیت دیکھ کر اس کے ساتھ رویہ اختیار کریں۔ آپ ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانْفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ

(آل عمران، ۳: ۱۵۹)

”(اے حبیبِ والا صفات!) پس اللہ کی کیسی رحمت ہے کہ آپ ان کے لیے نرم طبع ہیں اور اگر آپ تُندخُو (اور) سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد سے چھٹ کر بھاگ جاتے۔“

گویا آپ ﷺ کے ارد گرد معاشرے کے مقہور اور غریب و کمزور طبقہ کے اکٹھا ہو جانے کا سبب یہ تھا کہ آپ ﷺ بڑے نرم دل تھے۔ آپ ﷺ سے لوگ کچھ لینے آتے تو آپ ﷺ ان کی

جھولی بھی بھرتے اور خیر کی دعائیں بھی دیتے۔ پس ہر ایک کے لیے چاہے وہ امیر ہو یا غریب، رحمت اور اخلاق کا پیکر بن جائیں۔ دوسروں کو عزت واحترام دیں، معاشرے کے بے آسرا اور بے سہارا لوگوں کی ہر قسم کی خدمت کریں اور ان کے ساتھ کسی قسم کے تعاون سے دریغ نہ کریں۔ ہمیشہ تالیف قلبی کا کام کریں یعنی جوڑنے والے بن جائیں۔ خاندان کو بچانے والے بن جائیں اور انسانیت کو بچانے والے بن جائیں۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَرْحَمُ اللهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ۔

(بخاري الصحيح، ۲۲: ۳۶۸، الرقم: ۶۸۲۸)

جو انسانیت پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔

☆ معاشرے کے باطنی حسن کو برقرار رکھنے کے لے محبت کے ساتھ ساتھ صلح جوئی بھی ایک نہایت اہم عنصر ہے۔ اس لیے ہمیشہ لوگوں کے درمیان صلح کروایا کریں۔ ارشاد فرمایا:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا۔

”اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑائی کریں تو اُن کے درمیان صلح کرادیا کرو۔“ (الحجرات، ۴۹: ۹)

صلح کروانا اور اختلافات ختم کروانا بھی رحمت و محبت ہی کا ایک اظہار ہے۔ اسی سے معاشرے میں اخلاقیات وروحانیت فروغ پاتی ہے۔

۷۔ عیب پوشی اور حاجت روائی

اعلیٰ معاشرے کی تشکیل میں ”عیب پوشی اور حاجت روائی“ کو ایک اہم ضابطۂ اخلاق کی حیثیت حاصل ہے۔ انسان کسی بھی شعبہ زندگی سے وابستہ ہو، اسے چاہیے کہ وہ دوسروں کی عیب پوشی اور رازداری کرنے والا بن جائے۔ ہمیشہ پردہ پوشی کو اپنا زیور بنائیں اور لوگوں کو معاشرے میں ذلیل ہونے سے بچائیں۔ جو لوگوں کی عیب پوشی کرتا ہے، اللہ اس کی عیب پوشی کرتا ہے۔ سیدنا عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللهُ فِي حَاجَتِهِ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (بخاري الصحيح، ۸: ۳۰۹، الرقم: ۲۲۶۲)

مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے (ظالموں کے) سپرد کرتا

ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی فرماتا ہے۔ جو کسی مسلمان سے اس کی ایک تکلیف دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی تکلیفوں میں سے تکلیف دور کرتا ہے۔ جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس (کے عیبوں) کی پردہ پوشی فرمائے گا۔''

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَا یَزَالُ اللهُ فِی حَاجَةِ الْعَبْدِ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِی حَاجَةِ أَخِیهِ۔

(المعجم الکبیر، ۵: ۱۱۸، رقم: ۴۸۰۱)

جب تک بندہ دوسرے کی حاجت روائی میں ہے، اللہ رب العزت اس کا مددگار رہتا ہے۔

۸۔ عدل وانصاف

اعلیٰ معاشرہ کی تشکیل عدل وانصاف کے قیام کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لیے ہمیشہ عدل وانصاف کا دامن تھامے رکھیں۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

فَاحْکُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ۔ (المائدة، ۵: ۴۲)

'' اور اگر آپ فیصلہ فرمائیں تو ان کے درمیان (بھی) عدل سے (ہی) فیصلہ فرمائیں (یعنی ان کی دشمنی عادلانہ فیصلے میں رکاوٹ نہ بنے)۔''

اگر فیصلہ کرنے لگو یا فیصلہ کروانے میں مددگار ہو تو پھر عدل وانصاف کا دامن کبھی نہ چھوڑا جائے۔ دو چار پیسوں کے عوض ظالم کے ساتھ کھڑے نہ ہوں، کم از کم یہ گرفت تو نہیں ہوگی کہ ظالم کی مدد کرتا تھا بلکہ ہمیشہ مظلوم کے ساتھ رہیں۔ مظلوم کی مدد کے عوض اللہ تعالیٰ کئی مشکلات حل فرمادیتا ہے۔ عدل وانصاف کا انحصار گواہی پر ہوتا ہے۔ اس لیے لازمی ہے کہ کبھی جھوٹی گواہی نہ دیں۔

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ یا خلیفۃ المسلمین میں ایک بہت اہم معاملے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا:

شَهَادَاتُ الزُّورِ ظَهَرَتْ بِأَرْضِنَا فَقَالَ عُمَرُ أَوَ قَدْ کَانَ ذَلِكَ قَالَ نَعَمْ فَقَالَ عُمَرُ وَاللهِ لَا یُؤْسَرُ رَجُلٌ فِی الْإِسْلَامِ بِغَیْرِ الْعُدُولِ. (موطا مالک، ۴: ۱۰۴۳، الرقم: ۲۶۶۶)

جھوٹی گواہیاں ہمارے ملک میں بہت پھیل گئی ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: سچ؟ اس نے کہا: ہاں۔ تب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اب کوئی شخص مسلمان قید نہ کیا جائے گا بغیر معتبر گواہوں کے۔

یاد رکھیں! عدل وانصاف کرتے وقت کسی کی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو نہ دیکھیں بلکہ اس

پر بھی صبر کرنے والے بن جائیں اور انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ دوسروں کی زیادتیوں کو بھلا کر اس سے خیر کرنا ہی احسان ہے۔ خیر کے بدلے خیر کرنا احسان نہیں بلکہ وہ تو ادلے کا بدلہ ہو گیا۔ احسان یہ ہے کہ وہ زیادتی کرے اور ہم بھلائی کرتے رہیں۔

معاشرے میں مذکورہ ضابطہ ہائے اخلاق کو پروان چڑھانے سے ہی ایک ایسا معاشرہ تشکیل پائے گا جو اعلیٰ روحانی و اخلاقی اقدار پر استوار ہو گا۔ ان خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے کردار سے معاشرے کو مثبت سمت دے سکیں۔

تجدید و احیائے دین، دعوت و تبلیغ حق، اصلاح احوال امت اور ترویج و اقامت اسلام کے عظیم مصطفوی مشن کے فروغ اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے آگہی کے لئے

ماہنامہ منہاج القرآن

کی سالانہ خریداری حاصل کریں

زیر سرپرستی
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

فی شمارہ: 60 روپے
سالانہ خریداری: 700 روپے

اپنے علاقے میں موجود پبلک لائبریریز، کالجز، سکولز، عوامی مقامات، دوست احباب اور علاقے کی موثر شخصیات کو سالانہ خریداری کی صورت میں تحفہ بھجوائیں

365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 042-111-140-140 Ext: 128
0300-8886334 Whatsapp: 0300-8105740
Web:www.minhaj.info Email:mqmujallah@gmail.com

فقہ واصول کی تدوین اور ضرورت و اہمیت

مفتی ارشاد احمد ساحل

عہدِ رسالت مآب ﷺ کے سنہرے اور بابرکت دور کو دنیا نے جب الوداع کہا تو اسلام بحر و بر کی وسعتوں کو اپنی سعادتوں سے ہمکنار کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ جیشِ اسامہ کی روانگی نے عراق و ایران کی سرحدیں مملکتِ اسلام میں ضم کرنے کی طرح ڈالی اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت تک متعدد ممالک اسلام کی آغوشِ رحمت میں آگئے۔ توسیع کا یہ سلسلہ دراز رہا اور عہدِ عباسیہ میں مسلم سلطنتیں ہر قابلِ رشک نعمت سے سرفراز ہو چکی تھیں۔

تہذیب و ثقافت کا انضمام اور ملک و قوم کے تبادلے اپنے ساتھ بہت سے وسائل بھی لاتے ہیں اور مسائل بھی۔ مسائل و وسائل کے ہجوم بہت سی طرفہ سامانیوں کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ زبان پر سان چڑھتی ہے، نت نئے الفاظ درآمد ہوتے ہیں، نئی تہذیبیں جنم لیتی ہیں، افکارِ نو کا ہجوم ہوتا ہے، نئے نویلے آداب و فنون سے آگاہی ہوتی ہے۔ نیا سماج، نئے لوگ، نیا ماحول، نیا انداز، سب کچھ نیا نیا سا، اس اچھوتے ماحول میں اسلام اور اہلِ اسلام کو جذب (adjust) ہونے کے لیے فکر و عمل کے طور طریقوں میں خاص تراش خراش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہی ضرورت نئی اصطلاحات، نئے فنون، نئے علوم و آداب کی ایجاد و تدوین کی اصل محرک ہوتی ہے۔

یہاں پر ایک سوال سطحِ ذہن پر ابھرتا ہے کہ کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے فقہ و اصول کی تدوین اور ان کے قواعد کے انضباط کی ضرورت کیا ہے۔۔۔؟ قرآن حکیم میں ہر خشک و تر کا بیان ہے، سارے اصول و ضوابط موجود ہیں۔ قرآنی اصول کی جامع تشریحات احادیث مبارکہ میں مکمل طور سے ملتی ہیں۔ اللہ اور رسول ﷺ نے ہر ہر قدم پر امتِ مسلمہ کو رہنما اصول دیے ہیں تو پھر ایک نئے فن کی تدوین اور اس کے ہاتھوں میں امتِ مسلمہ کی زمام دینے کی ضرورت کیا ہے۔۔۔؟ حبل اللہ کے ہوتے ہوئے، کسی عبقری کی نیاز مندی کا قلادہ اپنی گردن میں کیوں ڈالا جائے۔۔۔؟ کتاب و سنت کے سرچشمۂ شیریں کے ہوتے ہوئے کسی اور سمت رخ کرنے کا جواز کہاں پیدا ہوتا ہے۔۔۔؟ یہ سوالات ہماری ایمانی حس کے تقاضے ہو سکتے ہیں۔ ان کا واضح اور مفصل جواب کثیر صفحات اور وسیع اوقات چاہتا ہے۔ لیکن ذیل کی چند سطروں میں اس کی واجبی وضاحت ضرور پیش کی جائے گی۔

یہ جہان فطرتاً تغیر پذیر اور مائل بہ ارتقا ہے۔ کائنات کا یہ ارتقائی سفر اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک اس کی قبائے وجود مکمل طور سے تار تار نہ ہو جائے۔ کل یوم ھوفی شان (رب کائنات ہر دن ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے) کی جلوہ گری کائنات کے ذرے ذرے میں سمائی ہوئی ہے۔ جو سماں کل تھا، وہ آج نہیں، جو آج ہے وہ کل نہیں رہے گا۔ معاشرے کے دہرے دہرے وجود میں یہ تبدیلیاں اور ترقیاں بہت واضح انداز سے محسوس کی جاسکتی ہیں۔ یہاں تک کہ مظاہرِ فطرت جو ایک سے دکھتے چلے آرہے ہیں، ان کی جلوہ گری بھی ایک سی نہیں ہوتی۔ سورج بظاہر اسی مشرق سے نکلتا ہے اور اسی مغرب میں ڈوبتا ہے لیکن اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس کی جائے طلوع ہر دن بدلتی رہتی ہے اور مقامِ غروب بھی ہر دن تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ سرد و گرم موسم، لمبی اور چھوٹی راتیں، مہ و نجوم اور بادلوں کی آنکھ مچولیاں، چاند اور سورج کی داغداریاں (گہن)، رتوں کی بھیگتی سوکھتی پلکیں، حکومتوں کے بدلتے زاویے، ثقافتوں کے تبادلے، سمٹتی پھیلتی سرحدیں، قانونِ قدرت کا مزاج سمجھاتی ہیں، حرکت و عمل پر آمادہ رکھتی ہیں، زمانے کی سیدھی رفتار کا ساتھ دینے پر مہمیز کرتی ہیں۔ یہ بتاتی ہیں کہ انجماد و تعطل کا زندگی سے بھرپور اس شاداب ہنستی بولتی کائنات سے دور کا واسطہ نہیں۔

جو فطرت کا یہ مزاج نہیں سمجھے گا، اس کی گھومتی بدلتی تیز رفتار کا ساتھ نہیں دے گا، وہ پسِ منظر میں چلا جائے گا اور زمانہ اس سے دامن جھٹک کر بہت برق رفتاری سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ چاہے وہ شخص ہو یا تحریک، مذہب ہو یا تمدن، علم ہو یا اندازِ عمل۔ اسلام جب دینِ فطرت ہے تو وہ فطرت کی ان رواں دواں تبدیلیوں اور تغیر آشنا مزاج سے دامن کش کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔؟ اسلام تو قیامت تک اس دنیا کا ہمدم و ہم ساز سدا بہار رہنما مذہب ہے، اس لیے اس کا انجماد و تعطل سے بھلا کیا ربط ہو سکتا

ہے۔۔۔؟ ہاں! اس کی اپنی ٹھوس، غیر متزلزل اور مستحکم بنیادیں ہیں، اس کا اپنا دلکش و پاکیزہ دائرہ کار ہے۔ وہ دنیا کے دامن میں نہیں سمٹتا بلکہ دنیا کو اپنی مقدس آغوش میں سمیٹتا ہے۔

اس تغیر مآب کائنات کے پس منظر میں اب دنیاوی اصول و قوانین کی حدیں، ماہیتیں اور کیفیتیں ملاحظہ کیجئے۔ کسی ملک کا قانون ہو، ہر نصف صدی کے بعد اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کئی دفعات نکالنی پڑتی ہیں۔ بہت سی شقیں داخل کرنی ہوتی ہیں اور کسی میں جزوی ترمیم (Amendment) جگہ پاتی ہے، حالات اور کیفیات کے منظر نامے جوں جوں تبدیل ہوتے ہیں، اصول و قوانین کے کینوس بھی رخ بدلتے رہتے ہیں۔ قوانین کی یہ توسیعاتی کیفیت ایسی روشن ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اب اسلام کے قانونی رخ کو دیکھتے ہیں تو اس پر الیوم اکملت لکم دینکم کی صورت میں یہ مہر ثبت ملتی ہے کہ اس کے جتنے اصول و ضوابط تھے مکمل ہو چکے، دین تکمیل کے مرحلے سے گزر چکا، کتاب و سنت کا لازوال سرچشمہ امتِ مسلمہ اور سعید دنیا کی پیاس بجھاتا رہے گا۔ ہر خشک و تر کتاب و سنت کی وسعتوں میں سما چکے۔ اب اس ضابطۂ خالقِ کائنات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ پھر قدرت کے ان اصولوں کا کیا ہو گا، جنہیں تبدیلیاں ہی راس آتی ہیں، یہ تغیر پذیر کائنات اسلام کے غیر متبدل اور اٹل مزاج کا ساتھ کیسے دے سکے گی۔۔۔؟ آئے دن طوفانوں کی مانند جو مسائل امنڈتے رہتے ہیں، ان کا کیا ہو گا۔۔۔؟ اسلام عرب سے نکل کر، بحر و بر کی وسعتوں میں پھیلے گا تو یہ بھانت بھانت کے سماج، بولیاں، روایتیں، رسمیں اور تہذیبیں اسلام سے کس طرح مانوس ہوں گی۔۔۔؟ کیا اسلام کائنات کی ان تمام رنگا رنگیوں کو دفن کر دے گا یا انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر چلے گا۔۔۔؟ نئے سماج، نئے وقت اور نئے حالات کی تبدیلیوں کو اسلام کی میزان پر کیوں کر تولا جا سکے گا۔۔۔؟ اگر مزاج اور ماحول کی ان تبدیلیوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو دنیا اس کی تقدس مآب آغوش میں کیسے سما سکے گی۔۔۔؟ اس طرح کے نہ جانے کتنے سوالات ہیں جو دماغ کی زیریں سطح پر ابھرتے رہتے ہیں۔ جبکہ اسلام ابدی اور لافانی مذہب ہے، اسے ہر زمانے کی قیادت کرنی ہے۔

الغرض اسلام کے شاداب اور مستحکم اصول اور یہ نگار خانہ کائنات دونوں قیامت تک سدا بہار رہیں گے۔ پھر ان دونوں کو ہم آہنگ کرنے کی صورت کیا ہے۔۔۔؟ اس خلیج کو پاٹنے، اس گیپ کو ختم کرنے اور ان دونوں مختلف جہتوں کو مانوس کرنے کی صرف ایک راہ ہے، جسے اجتہاد کہتے ہیں اور اسی نشانِ منزل کی توجہ کے لیے فقہ و اصول کی تدوین عمل میں آئی۔ بات ذرا مبہم سی رہ گئی۔ کتاب و سنت کے ارشادات سے اعتبار دیتے ہوئے اسی کی مختصر وضاحت پیش ہوتی ہے:

کتاب اللہ میں یقیناً ساری چیزوں کا بیان ہے لیکن اس کے اصول جامع، مختصر اور گہرے ہیں، جن تک پہنچنے کے لیے ہم آپ تو کجا حضرات صحابہ بھی رسول محتشم ﷺ کی بیان فرمودہ تشریح کے محتاج تھے۔ سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سورہ بقرہ کی تعلیم اڑھائی سال میں حضور ﷺ سے مکمل فرمائی۔ تکمیل کے بعد خوشی میں احباب کی شاندار ضیافت کا اہتمام فرمایا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خود فصیح عرب تھے، انہیں قرآنی متن کو سمجھنے کے لیے کسی کے تعاون کی ضرورت ہی کیا تھی، پھر آپ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے اڑھائی سال اڑھائی پارے کی تعلیم میں کیا سیکھتے رہے۔۔۔ کیا صرف لفظوں کے معانی۔۔۔؟ نہیں بلکہ وہ اسرارِ قرآنی اور رموزِ ربانی جو نورِ الٰہی سے روشن دلوں کو عطا ہوتے ہیں۔ ان ہی اسرار کے گہرے قرآنی سمندر کی نشاندہی یہ حدیث پاک فرماتی ہے کہ اگر سارے سمندر روشنائی اور سارے درخت قلم بنا دیئے جائیں اور ان سے قرآن حکیم کے اسرار و عجائب قلم بند ہوں پھر بھی وہ ختم نہ ہوں گے۔

اگر قرآن حکیم کا معاملہ صرف متن کے ظاہری رخ تک محدود ہوتا تو پھر اس کے عجائبات لامحدود کیسے ہو سکتے تھے۔ قرآن حکیم اسرار و معانی کا ناپیدا کنار سمندر ہے، جس کی شناوری ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے ایک مخصوص معیار کا علم، نورِ الٰہی سے روشن سینہ، مشکوٰۃ نبوت کی جاں بخش ضیاؤں سے مستنیری اور بالخصوص توفیق الٰہی سے سرفرازی ضروری ہے، تبھی وہ قرآن میں چھپے کائنات اور ماورائے کائنات کے اسرار دریافت کر سکتا ہے۔ یہ معیار فقہائے صحابہ کو حاصل تھا، جو ارشاداتِ نبوت کے قیمتی خزانوں کے امین ہیں۔ اسی لیے اسلام کا یہ مسلم اصول ہے کہ قرآن حکیم کو صرف متن قرآن اور لفظوں کی پرکھ سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے لیے احادیث مبارکہ کی پرنور رہنمائی ضروری ہے۔ اس کے بغیر جو قرآن کو سمجھنا چاہے، گمراہی اس کا مقدر ہے۔

اب احادیث مبارکہ کی معنوی گہرائی کی سمت توجہ کی جائے تو ہمیں یہ ارشاد رسالت جگمگاتا نظر آتا ہے: اوتیت بجوامع الکلم۔

مجھے مختصر اور جامع کلمات کا معجزہ عطا کیا گیا۔

معجزہ وہی چیز ہوتی ہے جو مافوق الفطرت ہو، جو دوسروں کا مقدور نہ ہو اور جسے حضور ﷺ نے بطورِ امتیاز پیش فرمایا ہو۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ حضور کے ارشادات معانی و مفاہیم کی گہری تہیں رکھتے ہیں جو بیک نگاہ منکشف نہیں ہو سکتیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا مبارک بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو برتن حاصل کیے ہیں۔ ایک کو بیان کرتا ہوں، اگر دوسرا بیان کروں تو میرا یہ گلا کاٹ دیا جائے۔ (بخاری شریف، ۱: ۲۳) ارشاداتِ نبوت کی تفہیم کے لیے ان نفوسِ قدسیہ

کی تشریحات مطلوب ہیں جن کی پر نور نگاہیں جمالِ نبوت کے دیدار سے جگمگ جگمگ کرتی ہیں۔۔۔ جن کے دل انوارِ نبوت سے روشن روشن ہیں۔۔۔ جن کی سماعتیں الفاظِ نبوت کی لذت چشیدہ ہیں۔۔۔ جنہوں نے براہ راست مہبط وحی سے وحی ناطق اور غیر ناطق کو سنا، سمجھا اور دل میں بسایا ہے۔۔۔ جو بارگاہِ رسالت کے مزاج شناس تھے۔ اگر حضرات صحابہ کی رہنمائی کے بغیر کوئی احادیث کے سرچشمے سے فیض اٹھانا چاہے تو ٹھوکریں اس کا مقدر ہیں۔ کیونکہ اہلِ محفل ہی میرِ محفل سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ یونہی افکارِ صحابہ کے ذخائر ان کے حاضر باش حضراتِ تابعین کے توسط سے سمجھیں۔

کوئی بھی قانون ایسا جامع نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک دوسرے کے سارے حالات و معاملات، وسائل و مسائل کا حکم واضح کر سکے، چہ جائیکہ وہ سارے زمانوں کے حالات اور معاملات کا احاطہ کر سکے۔ قانون ہمیشہ ایک کسوٹی ہوتا ہے، حالات اور معاملات کو اس پر پیش کر کے پرکھا جاتا ہے، اس پیشکش اور اس کے نفاذ کے لیے کارپردازان قانون کو فکر و تدبر اور سلیقہ مندی سے کام لینا پڑتا ہے۔ قانون کی سطح عموماً سپاٹ ہوتی ہے لیکن وہی قانون دیرپا اور رائج ہو پاتا ہے، جس کے اندر لچک (Flexibility) ہوتی ہے اور زمانے کے مزاج کو ایک حد تک ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے نفاذ کی کوشش کی جاتی ہے۔ بے لوچ اور کرخت، یک رخا مزاج رکھنے والا قانون یا تو خود ٹوٹ جاتا ہے یا پھر اسے توڑ دیا جاتا ہے۔

اسلام ابدی اور لازوال مذہب ہے اور قیامت تک کے دردمندوں کا چارہ ساز، اس لیے اس کے سارے اصول فطرت سے ہم آہنگ اور اس کے مزاج کا خاصا خیال رکھتے ہیں۔ ان میں نرم خوئی، لچک

داری اور ہر حال اور ماحول میں ضم (Adjust) ہونے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ ان میں بے تکا پن اور کرختگی نہیں ہے لیکن اسے ہر حال، ماحول اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے نافذ کرنے کے لیے اعلیٰ اسلامی شعور کی ضرورت ہے، جو ان جامع اصولوں سے نئے نئے مسائل کے احکامات برآمد کرسکے۔ اسی شعور کی قوت کو ملکۂ اجتہاد کہتے ہیں۔ قرآن وسنت میں دین اسلام کی تکمیل کا یہی مطلب ہے کہ اسلام کے سارے بنیادی احکام اور لازمی اصول مکمل ہوچکے۔

الحلال ما احل الله والحرام ما حرم الله وما سکت عنه فهو معفوعنه۔

حلال وہ چیز ہے جسے اللہ نے حلال ٹھہرایا اور حرام وہ چیز ہے جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا اور جس کے بارے میں کوئی حکم وارد نہیں ہے، وہ مباح ہے۔

ان بنیادی اصولوں میں کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی لیکن ماحولیات کے بدلاؤ سے جو حالات رونما ہوتے ہیں، ان کی اسلامی اصولوں کی روشنی میں تفہیم ضرور ہوسکتی ہے۔ فقہ واصول یہی کارنامہ انجام دیتے ہیں اور ملکۂ اجتہاد یہی فرض ادا کرتا ہے۔ فقہا الگ سے ہٹ کر کچھ نہیں کہتے۔ وہ نورِ خدا سے منور دل رکھتے ہیں، علم لدنی کے شرف سے سرفراز ہوتے ہیں اور اسلامی اصول ومصادر کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ وہ نت نئے حالات کو کتاب وسنت کے معیار پر پیش کرکے ان کی زیریں سطحوں سے اس کا شرعی حکم برآمد کرلیتے ہیں، جہاں تک عام نگاہوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ جیسے دنیاوی ایجادات کرنے والے افراد کائناتِ فطرت کا گہرا مشاہدہ کرکے عام نگاہوں سے چھپے راز دریافت کرلیتے ہیں، پھر انہیں عوام کے لیے مفید بناکر دنیا کے سامنے پیش کردیتے ہیں اور ساری دنیا اس سے بے تکلف فائدہ اٹھاتی ہے لیکن ایسے موجدین، خالق نہیں ہوتے بلکہ منتظم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی ایجادات بھی قدرت کا کرشمہ ہی کہی جائیں گی اور اللہ کی ملکیتیں ہی شمار ہوں گی۔ البتہ ایسے موجدین مادی دنیا کے قائد اور محسن ضرور سمجھے جائیں گے۔

یونہی ائمہ مجتہدین شریعت کا گہرا شعور رکھنے کی وجہ سے نت نئے معاملات کی تفہیم کا فریضہ اسلام کی سطح سے انجام دیتے ہیں۔ شریعت کے مصادر کی روشنی میں انھوں نے ایسے اصول ایجاد کیے ہیں، جن کی روشنی میں حالات ومعاملات کا اسلامی فہم آسان ہوجاتا ہے اور پوری دنیا ان کے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں اسلامی قوانین پر سہولت کے ساتھ عمل پیرا ہوجاتی ہے۔ اہل دنیا کو خود احکام اخذ کرنے اور استنباط کرنے کی زحمتیں گوارا نہیں کرنی پڑتیں اور نہ وہ اس کے اہل ہیں۔ یہ ائمہ مجتہدین اس ترتیب و استنباط کے سبب شارع نہیں ہوجاتے بلکہ شریعت کے خادم ہی رہتے ہیں۔ البتہ اعلیٰ سطح کی اسلامی خصوصیات کے سبب وہ امت کے لیے آسانی کا سبب بنتے ہیں، اس لیے امت مسلمہ میں انہیں ایک

خصوصی امتیاز نصیب ہوتا ہے اور اس کی بدولت وہ اسلامی قائد، رہنما، امام اور قابلِ اقتدا شخصیت شمار ہوتے ہیں۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ امتیازات چاہے وہ جس رخ کے ہوں، بہر طور قابلِ تقلید و احترام ہوتے ہیں اور ایسے افراد قبولِ عام سے بہر طور سرفراز ہوتے ہیں۔ اس لیے ائمہ مجتہدین کی تقلید کو دین سے جدا کسی فکر کی پیروی سمجھنا عقل و فہم کا دیوالیہ پن ہے۔ حضرات ائمہ جیسے افراد تو امت مسلمہ کا انتخاب ہوتے ہیں اور قرآن حکیم کے ارشاد کی روشنی میں امت کے رہنما۔ ارشاد ربانی ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ۔

”تو ان میں سے ہر ایک گروہ (یا قبیلہ) کی ایک جماعت کیوں نہ نکلے کہ وہ لوگ دین میں تفقُّہ (یعنی خوب فہم و بصیرت) حاصل کریں اور وہ اپنی قوم کو ڈرائیں جب وہ ان کی طرف پلٹ کر آئیں تاکہ وہ (گناہوں اور نافرمانی کی زندگی سے) بچیں۔“ (التوبۃ، ۹: ۱۲۲)

احادیث مبارکہ میں ایسی خوبیوں والے افراد کو بہت سراہا گیا ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین۔ (مشکوۃ، کتاب العلم)

”جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دین کی سمجھ اور فقاہت عطا کر دیتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

نعم الرجل الفقیہ فی الدین ان احتیج الیہ نفع و ان استغنی عنہ اغنی نفسہ۔

کتنا اچھا ہے وہ شخص جو دین کا فقیہ ہو، اگر کوئی اس کے پاس دینی حاجت لے کر حاضر ہو تو وہ اس کی مدد کرے اور اگر اس سے دنیا بے نیازی کا معاملہ رکھے تو وہ بھی اپنے آپ کو بے نیاز بنا لے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد۔

ایک فقیہ شیطان کی جان پر ہزار عابد سے زیادہ گرانبار ہے۔

(رواہ ابن عباس، مشکوۃ، کتاب العلم)

یہ امتیازات اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ سے ایک فقیہ اور مجتہد کو عطا ہوئے ہیں، اس لیے ان کی ذواتِ قدسیہ یقیناً قابلِ احترام اور لائقِ تقلید ہیں۔

اصول دین کی تفہیم کے لیے نئے نئے اچھے طریقے ایجاد کرنا، جن سے مقاصد دین پورے ہوتے ہوں، مطلوبِ شریعت بھی ہے۔ جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اجورهم شئی۔

جو شخص اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کرے، اس ایجاد کا ثواب ملے گا اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے، ان سب کا مجموعی ثواب اس موجد کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا اور لطف یہ ہے کہ ان پر عمل پیرا لوگوں کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ (مشکوۃ، کتاب العلم، ص: ۲۵)

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ ایسے فنون وآداب، اطوار وعادات کو برتنا جو نئے ہوں لیکن دین سے متعلق ہوں، اس کے مقاصد کی تکمیل میں مفید ہوں اور ان سے اسلام کے کسی متعین اصول کی نفی نہ ہوتی ہو، فرمانِ رسول اور مزاجِ شریعت کے مطابق ہے۔ یہی وہ بنیادی ہدایت ہے جو اسلام کے بنیادی اصولوں کو حالاتِ زمانہ کے اعتبار سے adjust کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اور زمانے کے تغیرات کو بہت سہولت، نرمی، لچک اور سلیقے سے برتتی ہے۔ قرآن حکیم کی جمع وترتیب، علوم قرآن اور فنون حدیث کی تدوین یہ سب کچھ بعد کی چیزیں ہیں اور مخلصین اسلام کی پاکیزہ ذہنوں کی ایجاد۔ حضرات ائمہ مجتہدین اس حدیث کے بہترین مصداق ہیں، وہ امتِ مسلمہ کے سامنے ایسے بہتر طریقے پیش کر گئے جن کی برکتوں سے ہزار سال کے بعد بھی دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ اگر وہ اور ان کے یہ عظیم الشان کارنامے نہ ہوتے تو آج امت مسلمہ کس مشقت سے دوچار ہوتی، ہم آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے، لیکن ائمہ مجتہدین کی یہ ایجادِ فنون کتاب وسنت کے سرچشمے سے ہی مستفاد ہے۔ جس طرح قرآن حکیم کی جمع وترتیب، احادیث مبارکہ کی تدوین عہد رسالت کے بعد کی چیزیں ہیں لیکن ان کا سرا عہد رسالت میں موجود تھا۔ کیونکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن حکیم کو چمڑوں پر، کھجور کی چھالوں پر لکھواتے، باضابطہ کاتبین وحی متعین تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیان فرمودہ ترتیب کے مطابق آیات وسور کو لکھتے جاتے۔ کتابت حدیث کا بھی قرآن جیسا نہ سہی لیکن اہتمام ضرور تھا، اس لیے بعد میں جمع قرآن اور تدوین حدیث کا کارنامہ منشائے نبوت کے مطابق تھا اور خود ان کے پس پردہ الٰہی مشیت اور ایزدی تائید کارفرما تھی۔ ٹھیک اسی طرح فقہ واصول اور اجتہاد وتقلید کا نقطہ آغاز بھی عہد رسالت کی ہی دین ہے اور اس کی جڑیں کتاب وسنت کے سمندروں سے پانی لیتی ہیں۔

یہ حدیث اہل علم کے درمیان کافی شہرت رکھتی ہے کہ 10ھ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو ارشاد فرمایا: معاذ! تم امت مسلمہ کے مسائل کا

فیصلہ کیسے کروگے؟ عرض کی: یارسول اللہ! کتاب اللہ کی روشنی میں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر وہ حکم صراحتاً اس میں نہ ملے تو؟ عرض کیا: آپ ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں۔ فرمایا: اگر میری حدیث میں بھی تمہیں وہ حکم دستیاب نہ ہو تو؟ عرض کیا: یارسول اللہ! اجتھد برائی ولا آلو میں بے تکلف کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔

رسول محتشم ﷺ کا چہرہ اس جواب سے کھل اٹھا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے مبارک سینے پر دست کرم پھیرتے ہوئے فرمایا:

الحمد الله الذی وفق رسول رسول الله لما یرضی به رسول الله۔ (مشکوٰۃ، کتاب الامارۃ)

اللہ تعالیٰ کا بے پناہ شکر واحسان کہ اس نے اپنے رسول کے ترجمان کو ایسی اچھی فکر کی توفیق دی، جس سے اس کا رسول ﷺ راضی ہے۔

اس حدیث کا روشن مفہوم یہی ہے کہ فقہ واجتہاد وقت کی ضرورت ہے اور اسلام کی تفہیم کا شاندار ذریعہ، جسے بارگاہ نبوت کی بھرپور تائید حاصل ہے اور اسی کے ذریعہ اسلام کے مستحکم اصول ہر زمانے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان بنتے ہیں۔ یہی نرمی اسلامی قوانین کو قبولِ دوام اور ہر ماحول میں انضمام کا سہرا عطا کرتی ہے۔

عہد رسالت کے بعد عہد صحابہ کی روش بھی فقہ واصول کی بنیادیں مستحکم کرتی نظر آتی ہے۔ سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں صحابی رسول حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (گورنر) کو ایک طویل فرمان بھیجا، جس میں یہ ہدایت بھی تھی:

الفهم الفهم فی مایختلج فی صدرك مما لم یبلغك فی القرآن والسنة۔ اعرف الامثال والاشباه ثم قس الامور عند ذلك فاعمد الی احبها الی الله واشبهها بالحق فی ماتری۔

اچھی طرح سمجھ کر فیصلہ کرو یا بالخصوص اس مسئلہ میں جو تمھارے دل میں تردد کا سبب بن رہا ہو۔ قرآن وسنت سے وہ بات تمھیں معلوم نہ ہوئی ہو، ایسے موقع پر ملتے جلتے ایک دوسرے سے مشابہ مسائل کو پہچانو پھر اس وقت مسائل میں قیاس سے کام لو اور جو جواب تمھیں اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور حق سے زیادہ قریب نظر آئے، اسے اختیار کرو۔

ان بیانات سے خوب اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات ائمہ نے فقہ واصول کی تدوین کرکے اپنے لیے اور ساری امت کے لیے کیسی سعادت کا سامان کیا ہے اور امت مسلمہ کی کیسی دستگیری فرمائی ہے۔

(جاری ہے)

نالج بیسڈ اکانومی اور پاکستان کی ترقی

پروفیسر ڈاکٹر حُسین محی الدّین قادری

جب عالمِ مغرب میں صنعتی نقلاب (industrial revolution) آیا تو اس کے بعد سے معیشت Labour intensive economy کہلانے لگی۔ اس کے اجزاء میں سرمایہ (capital)، زمین (land)، محنت (labour) اور قدرتی وسائل شامل ہیں۔ گویا اس اکنامک ماڈل میں جس ملک کو جس قدر وسائل میسر ہوتے ہیں وہ اتنا ہی معاشی طور پر زیادہ پختہ ہوتا ہے۔ اس معاشی ماڈل نے ایک طویل عرصہ پوری دنیا پر راج کیا۔ بعد ازاں اسی ماڈل کے اندر سیاست، ٹیکنالوجی اور مشین داخل ہو گئی جس کی وجہ سے پروڈکشن میں اضافہ ہونے لگا۔ کچھ دہائیاں قبل دنیا نے ایک اور کروٹ لی اور صنعتی انقلاب کے بعد ایک بڑی تبدیلی معاشی میدان پر رونما ہوئی اور ایک نیا اکنامک ماڈل knowledge based Economy منظر عام پر آیا۔ اس اکانومی کے دو اہم پہلو ہیں:

۱۔ knowledge (علم)

۲۔ Economy (معیشت)

نالج سے مراد خبر، علم اور Skills (ہنر) ہیں۔ وہ تمام نئے علوم و فنون جن میں سائنسز، ٹیکنالوجی اور ان کو استعمال کرنے کا ہنر شامل ہے، یہ سارے عوامل مل کر لفظ نالج تشکیل دیتے ہیں۔ نالج بیسڈ اکانومی سے مراد یہ ہے کہ وہ اکانومی جو اب صرف سرمایہ، محنت، قدرتی وسائل، زمین اور سرمایہ کاری پر منحصر نہ ہو بلکہ علم، ہائیر ایجوکیشن، ٹیکنالوجی، سائنس، سافٹ ویئر، آئی ٹی اور non tangible

resources پر انحصار کرے۔ مزید یہ کہ اس تمام ایجوکیشن، Skills اور ٹیکنالوجی کو یوں استعمال کیا جائے کہ اس سے معاشی وسائل اور دولت پیدا ہو تو اس کو نالج بیسڈ اکانومی کہا جائے گا۔

نالج بیسڈ اکانومی کی ضرورت کیوں؟

کئی دہائیوں سے ماہرین معیشت اور حکومتیں اس بات پر مصر ہیں کہ دنیا کا مستقبل نالج بیسڈ اکانومی ہے۔ اس ماڈل کی طرف رجحان کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً: قدرتی وسائل میں سے کئی ممالک کو تیل میسر آیا اور انھوں نے اس کے ذریعے اپنے ملک و قوم کو ترقی دی۔ پہلے وہ محض صحرا تھے مگر معدنی دولت تیل کے ذریعے انھوں نے اپنے ممالک کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اسی طرح مختلف ممالک کو سونا اور دیگر معدنیات کی صورت میں جو کچھ بھی قدرتی وسائل میسر آئے انہوں نے ان کو استعمال میں لا کر ترقی کی مگر اب صورت حال یہ ہے کہ یہ وسائل اب دنیا سے ختم ہونے جا رہے ہیں۔ معدنی تیل کے بارے میں پیشین گوئیاں ہیں کہ کسی ملک کے پاس دس سال، کسی کے پاس بیس سال اور کسی کے پاس چالیس پچاس کا تیل باقی رہ گیا ہے۔ اسی طرح دیگر قدرتی وسائل کا بھی یہی حال ہے۔ اس صورتِ حال میں دنیا میں ایک نئی سوچ پیدا ہوئی اور کہا گیا کہ ہم نے اب قدرتی وسائل پر انحصار نہیں کرنا بلکہ نالج بیسڈ اکانومی کی طرف جانا ہے جہاں تسلسل کے ساتھ ہمیشہ ترقی (growth) ممکن ہو سکے اور یہ ترقی اس انداز میں ہو کہ وہ کبھی ختم نہ ہو سکے۔ آج اس اکنامک ماڈل کی طرف تمام ممالک نے اپنی توجہ مبذول کر لی ہے۔

نالج بیسڈ اکانومی کے اجزاء اور ان کا کردار

اس اکنامک ماڈل کے اندر ہائیر ایجوکیشن، سائنسز، ٹیکنیکل ایجوکیشن، چھوٹی، درمیانی اور بڑی صنعت، ربوٹک مشینری، سوفٹ ویئر، آئی ٹی، انٹرنیٹ اور آرٹیفیشل انٹیلی جینس (AI) کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ آج لوگ نالج بیسڈ اکانومی سے استفادہ کر رہے ہیں اور مختلف مسائل کا حل اس اکنامک ماڈل کے ذریعے نکالا جا رہا ہے۔ مثلاً جب کوئی نئی App بنتی ہے تو لوگ اسے استعمال کرتے ہیں، اس سروس کو مارکیٹ میں فروخت کیا جاتا ہے اور اس طرح یہ پروڈکٹ ان کے لیے آمدنی پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یاد رکھیں کہ اس اکنامک ماڈل کے لیے بہت بڑی افرادی قوت (manpower) کی ضرورت نہیں ہے کہ سیکڑوں افراد پر مشتمل set up قائم کیا جائے بلکہ اس کے لیے فقط چند ذہین افراد (smart brains) کی ٹیم کی ضرورت ہے۔ یعنی چند IT ایکسپرٹ، سوفٹ ویئر انجینئرز، آرٹیفیشل اینٹیلی جینس کے ماہرین پروڈکٹس تیار کرتے ہیں جو سالہا سال

لوگوں کی مدد کرتی رہیں گی اور اکانومی کی ترقی میں مدد فراہم کرتی رہیں گی اور اس طرح دولت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہم اپنے ارد گرد زندگی کے معمولات پر نظر دوڑاتے چلے جائیں تو ہمیں ایسی ہزاروں چیزیں ملیں گی جو آئی ٹی، سوفٹ ویئر، سمارٹ ایپلیکیشنز، سمارٹ پروسیجرز اور فنکشنز ہیں، یہ سب نالج بیسڈ اکانومی ہیں۔

نالج بیسڈ اکانومی کے قیام میں کارفرما عوامل

بنیادی سوال یہ ہے کہ نالج بیسڈ اکانومی کی دوڑ میں کون سے ملک آگے نکلے ہیں اور اس حوالے سے پاکستان کہاں کھڑا ہے۔۔۔؟ اگر دنیا کا مستقبل نالج بیسڈ اکانومی ہے تو ہم کہاں کھڑے ہیں۔۔۔؟ نالج بیسڈ اکانومی کے قیام کے کئی اہم عوامل ہیں جو کسی بھی ملک میں اسے پروان چڑھاتے ہیں۔ چند اہم عوامل درج ذیل ہیں:

۱۔ اس اکنامک ماڈل کے لیے ایک اہم عامل ہائیر ایجوکیشن ہے۔ کسی بھی ملک کے اندر ہائیر ایجوکیشن کا معیار یہ تعین کرتا ہے کہ اس ملک کا مستقبل نالج بیسڈ اکانومی میں کیا ہے۔

۲۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ کیا وہ ملک اشیاء کو بنانے کے روایتی طریقوں اور خدمات (ٹریڈیشنل مینوفیکچرنگ اینڈ سروسز) کے ماڈل پر کام کر رہا ہے یا سوفٹ ویئر، مشینری، ٹیکنالوجی کی بنیاد پر بڑے پیمانے پر انڈسٹریل مشینریز بناتا ہے۔ نیز ریبوٹک سائنسز کے اندر اس کا مقام کیا ہے اور وہ اپنے کتنے ماہرین ان ٹیکنالوجیز سے متعلق پیدا کر رہا ہے؟

۳۔ اس اکنامک ماڈل کے قیام کے لیے تیسری اہم چیز یہ ہے کہ دیکھا جائے گا کہ وہ ملک خدمات (Services) میں آگے ہے یا مینوفیکچرنگ میں آگے ہے؟

۴۔ چوتھی اہم چیز یہ ہے کہ اس ملک کے تعلیمی اداروں میں پڑھایا جانے والا نصاب کیا ہے اور اس ملک کے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل افراد (graduate) کا معیار کیا ہے؟ ان کی سکلز، ٹیکنالوجی ایجوکیشن اور صلاحیتوں کا درجہ کیا ہے؟ اس لیے کہ اسی کی قابلیت سے معلوم ہوگا کہ کیا یہ ملک نالج بیسڈ اکانومی کے قابل ہے یا نہیں؟

۵۔ پانچویں چیز یہ کہ اس ملک کی گورنمنٹ پالیسیز کیا ہیں؟ کیا یہ پالیسیز ملک کے اندر نالج بیسڈ اکانومی کے لیے ممد و معاون ہیں یا نہیں؟

۶۔ چھٹی اہم بات یہ ہے کہ اس ملک کی سافٹ ویئر پروڈکشن، کمپیوٹر اور آئی ٹی سے متعلقہ برآمدات (exports) کا معیار اور مقدار کیا ہے؟

ان مذکورہ اہم عوامل اور نکات سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کسی ملک کی اکانومی نالج بیسڈ ہو سکتی ہے یا نہیں؟

کیا پاکستان نالج بیسڈ اکانومی کی طرف گامزن ہے؟

آیئے! مذکورہ عوامل کے لحاظ سے حقائق کی روشنی میں پاکستان کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا ہم نالج بیسڈ اکانومی کی طرف گامزن ہیں یا ابھی اس تک پہنچنے میں بہت سفر باقی ہے؟

۱۔ اس سلسلے میں اگر ہائیر ایجوکیشن کی بات کی جائے تو ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں ہائیر ایجوکیشن تو دور کی بات شرح خواندگی (literacy rate) ہی بہت کم ہے۔ اکانومی نالج بیسڈ تو تب ہوگی جب نالج ہوگا اور اس نالج کا معیار بہتر ہوگا، تب جا کر اکانومی نالج بیسڈ ہوگی۔ پاکستان کی شرح خواندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ پچھلے پانچ سال سے ہماری شرح خواندگی 60 فیصد ہے۔ اس کے برعکس بنگلادیش سمیت ہمارے دیگر ہمسایہ ممالک میں شرح خواندگی کہیں 74 فیصد ہے، کہیں 96 فیصد ہے اور کہیں 99 فیصد ہے۔ ہماری 60 فیصد شرح خواندگی میں وہ افراد بھی شامل ہیں جنھوں نے میٹرک تک پڑھا ہوا ہے۔ ہم اسے بھی تعلیم یافتہ تصور کرتے ہیں۔ نالج، سوفٹ ویئر انجینئرنگ، ٹیکنالوجی، Rebotec مشینری اور آرٹیفیشل انٹیلی جینس کو سمجھنا میٹرک لیول تک کی تعلیم کے حاملین کے لیے بہت دور کی بات ہے۔

ہائیر ایجوکیشن میں اگر ہم اپنا موازنہ ہمسایہ ممالک سے کریں تو 25 کروڑ کی آبادی والے پاکستان میں آج تقریباً 188 یونیورسٹیز ہیں جبکہ ہمارے ہمسایہ ملک انڈیا میں 1500 سے زائد یونیورسٹیز ہیں۔ 30 کروڑ کی آبادی والے ملک امریکہ میں 5300 یونیورسٹیز ہیں اور چائنہ میں 2500 یونیورسٹیز ہیں۔ اسی طرح کئی اور ممالک میں یونیورسٹیز کی تعداد ہم سے بہت زیادہ ہے۔ نیز یہ ابھی یونیورسٹیز کی تعداد کی بات ہے، ان کے معیار کی بات نہیں کر رہے، جہاں سے نالج بیسڈ اکانومی کے لیے افرادی قوت نے تیار ہونا ہے۔

۲۔ پاکستان کے سوفٹ ویئر سیکٹر کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارا وہاں وجود ہی نہیں ہے۔ یاد رکھیں کہ جب ہم نالج بیسڈ اکانومی کی بات کرتے ہیں تو 60 فیصد سوفٹ ویئر اور It سیکٹر کی بات ہوتی ہے کہ وہ ملک کتنے سوفٹ ویئر، اپلی کیشنز اور سوفٹ ویئر انجینئرز پیدا کر رہا ہے؟ ان کا معیار کیا ہے اور اس حوالے سے حکومتی لیول پر سرپرستی کی سطح کیا ہے؟ 2005ء میں آج سے 19 سال قبل پاکستان کی سافٹ ویئر ایکسپورٹ تقریباً 200 ملین یو ایس ڈالر تھی اور آج پاکستان کی سافٹ ویئر ایکسپورٹ تقریباً 650 ملین یو ایس ڈالر ہے۔ 19 سال کے طویل عرصے میں پاکستان کی سافٹ ویئر ایکسپورٹ

صرف 450 ملین ڈالر تک پہنچی ہے۔ اس حوالے سے اگر انڈیا کا جائزہ لیں تو 2005ء میں انڈیا کی سافٹ ویئر ایکسپورٹ 17 بلین ڈالرز تھی جو 19 سال میں ترقی کرکے تقریباً 160 بلین یو ایس ڈالرز تک پہنچ چکی ہے۔

گویا پاکستان کی معیشت پر جتنا قرض ہے، انڈیا ایک سال میں اتنا سافٹ ویئر برآمد (export) کرتا ہے۔ ہمیں اس حوالے سے ہوش کے ناخن لینے کی ضرورت ہے۔ اگر کام عملی نہ ہو تو صرف دعوے اور نعروں پر کام چلایا جاتا ہے۔ اگر ترقی ہو تو اعداد و شمار خود بولتے ہیں۔ ہمارے ہاں جس چیز کو ترقی (growth) کا نام دیا جاتا ہے، یہ ترقی نہیں ہے بلکہ قوم کا وقت اور اکانومی کو برباد کیا جارہا ہے۔ اگر پاکستانی نوجوانوں کی طرف سے سوفٹ ویئر پروڈکشن اور آئی ٹی کے حوالے سے کوئی کارنامہ سامنے آتا ہے تو اس کا کریڈٹ صرف اور صرف پاکستان کی عوام کو جاتا ہے کہ اللہ رب العزت نے انھیں یہ صلاحیت دی ہے کہ انھوں نے نامساعد حالات کے باوجود یہ کارنامے کرکے دکھادیئے۔ انھیں ملکی سسٹم نے کسی کامیابی کے قابل نہیں بنایا۔ اس سسٹم نے قوم کے نوجوانوں میں یہ اہلیت پیدا نہیں کی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت (God gifted) ہے کیونکہ اگر حکومت کے دیئے گئے سسٹم نے یہ اہلیت پیدا کی ہوتی تو پاکستان IT اور سوفٹ ویئر پروڈکشن کے حوالے سے دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتا۔

۳۔ ٹیکنالوجی انڈسٹری کی بات کریں تو معلوم ہوگا کہ پاکستان نے طویل عرصہ صرف روایتی صنعت (traditional industries) کو قائم کرنے اور اس کو فروغ دینے میں گزارا ہے۔ یہاں تک کہ ان صنعتوں میں تیار ہونے والے مال کے لیے جو مشینری استعمال ہوتی ہے، وہ بھی پاکستان میں نہیں بنتی۔ اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ملک کی اکانومی کس سمت جارہی ہے، اس کے لیے یہ بہت اہم علامت ہے۔ ٹیکسٹائل میں پاکستان کا بڑا نام رہا ہے مگر ٹیکسٹائل مشینری جاپان، جرمنی، کوریا اور چائنہ سے آتی ہے۔ ترقی تو تب ہوگی کہ وہ مشینری بھی یہاں بنے، تب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا ملک صحیح سمت پر چل پڑا ہے۔ فوڈز پروڈکٹس کا بھی یہی ہے کہ فوڈز کی پروڈکشن تو ہورہی ہے لیکن اس کی مشینری یہاں پر نہیں بنتی۔ گویا پاکستان میں خدمات (services) ہیں مگر مینوفیکچرنگ انڈسٹری نہیں ہے۔

ہائیر ایجوکیشن اور ہمارے گریجوایٹس کی افسوسناک صورتحال

پورے ملک میں موجود ٹیکنالوجی سے متعلق ادارے جو ٹیکنیکل ایجوکیشن دے رہے ہیں، اگر ان کا جائزہ لیں تو واضح ہوجاتا ہے کہ وہ معیاری فضلاء (graduate) پیدا ہی نہیں کررہے بلکہ

صرف تعداد کی ریس میں لگے ہیں کہ ہم نے اتنے بیچلرز، اتنے ماسٹرز اور اتنے Ph.Ds پیدا کیے ہیں۔
ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ ہم ایسے گریجوایٹ پیدا کر رہے ہیں جو انٹر نیشنل compitition کے قابل ہی نہیں ہیں۔ ایسے ماحول میں سے جب کوئی ابھر کر سامنے آتا ہے تو اس نے جاری سسٹم کے برعکس اپنی صلاحیت منوائی ہے۔ جب تک سسٹم معاون نہ ہو تو ملک میں سے چیدہ چیدہ اہل لوگ نکلتے ہیں لیکن جب سسٹم معاون ہو جائے تو وہی ملک ہزاروں لاکھوں اہل پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے۔

پاکستان میں ہائیر ایجوکیشن کے حوالے سے پاکستان کی انڈسٹریز سے ایک سروے کیا گیا کہ ملک کی ہائیر ایجوکیشن ملک کی انڈسٹریز کے لیے جو گریجوایٹس پیدا کر رہی ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں۔۔۔؟ ان کے اندر کیا کمی دیکھتے ہیں۔۔۔؟ اس سروے کے دوران انہوں نے ایک پوری فہرست جاری کی ہے کہ ہائر ایجوکیشن سے پیدا ہونے والی افرادی قوت جب مختلف انڈسٹریز میں اپنی خدمات پیش کرتی ہے تو درج ذیل حوالوں سے ان کی نااہلی سامنے آتی ہے:

۱۔ 80 فیصد انڈسٹریز نے کہا کہ یہ گریجوایٹس زبانی ابلاغی (verbal communication) صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ یعنی یہ مدلل اور پختہ بات کرنے اور بات کو کرنے کے سلیقہ و قرینہ کو نہیں جانتے۔

۲۔ 71 فیصد انڈسٹریز نے کہا کہ نئے گریجوایٹس کا رویہ (attitude) پروفیشنل نہیں ہے۔

۳۔ 64 فیصد انڈسٹریز نے کہا کہ ان میں ٹیم ورکنگ کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

۴۔ 59 فیصد انڈسٹریز نے کہا کہ ان میں تنقیدی سوچ (Critical thinking) موجود نہیں۔ یعنی ان کی ایجوکیشن نے ان کے اندر کسی معاملہ کو Critical انداز سے دیکھنے کی صلاحیت پیدا نہیں کی۔

۵۔ 57 فیصد انڈسٹریز نے کہا کہ ان میں تحریری صلاحیت نہیں ہیں۔

۶۔ 59 فیصد انڈسٹریز نے کہا کہ ان میں خود اعتمادی (Self confidence) کی کمی پائی جاتی ہے۔

۷۔ 57 فیصد انڈسٹریز نے کہا کہ ان میں Resilience یعنی ابھرنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

۸۔ 47 فیصد کا کہنا ہے کہ یہ دباؤ برداشت (stress tolerate) کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

۹۔ 46 فیصد نے کہا ان میں نئے ماحول میں ڈھلنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

۱۰۔ 45 فیصد انڈسٹریز نے کہا کہ ان میں Time management نہیں ہے۔

۱۱۔ 45 فیصد انڈسٹریز نے کہا کہ ان میں خود آگہی (Self awareness) نہیں ہے۔

۱۲۔ 45 فیصد انڈسٹریز نے کہا کہ ان میں منصوبہ سازی اور تنظیم (planning and organization) نہیں ہے۔

۱۳۔ 43 فیصد نے کہا کہ Integrity یعنی امانت و صداقت کے مسائل بھی ان میں موجود نہیں۔

عملی اقدامات کی ضرورت

یہ اس نالج کی صورتحال ہے جس پر ہماری اکانومی کا دارومدار ہے۔ لہذا ہم سب کو بشمول گورنمنٹ بہت زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم ایسا کوئی اہتمام کررہے ہیں کہ ہم پاکستان کو بہتر افرادی قوت دے سکیں جو نالج پر اپنی اکانومی کی بنیاد قائم کرسکے اور ایک ایسا وقت آئے کہ سافٹ ویئر، ہارڈ ویئر اور مشینری بھی یہاں بنے۔ ہماری حالت تو یہ ہے اگر ہم گاڑی بھی بناتے ہیں تو پارٹس باہر سے لاتے ہیں اور صرف جوڑنے کا کام کردیتے ہیں جبکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہمارے ہاں ایک مکمل سپلائی چین موجود ہو۔ اس سلسلہ میں درج ذیل اقدامات کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ پاکستان میں صلاحیت و قابلیت کی کمی نہیں ہے بلکہ صرف قابل بندوں کو مواقع دینے کی ضرورت ہے اور یہ مواقع گورنمنٹ اور پرائیویٹ سیکٹرز نے دینے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے وسائل دیے ہیں۔

۲۔ نالج بیسڈ اکانومی مکمل طور پر ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹس پر منحصر ہوتی ہے۔ پاکستان میں گورنمنٹ اور پرائیویٹ سیکٹر میں ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹس شعبہ کی حالت انتہائی خراب ہے۔ گورنمنٹ اور پرائیویٹ سیکٹر سب اس خرابی میں برابر کے شریک ہیں، اکیلا کوئی بھی ذمہ دار نہیں ہے۔ اس صورت حال سے نکلنا تبھی ممکن ہوگا اگر گورنمنٹ اس معاملہ کو سنجیدہ لے۔ دنیا کی ترقی کی سمت کو دیکھے کہ اس وقت دنیا کی اکانومی کی سمت کیا ہے اور ہم نے کس طرف جانا ہے؟

۳۔ نالج بیسڈ اکانومی کے لیے حکومتی سطح پر پانچ یا دس سالہ پالیسی اور منصوبہ بنایا جائے اور پھر اس کے اوپر سختی سے تسلسل کے ساتھ ایک ہی سمت کام کیا جائے تو پھر نتائج سامنے آئیں گے۔ اگر ہر آنے والی حکومت پالیسیاں بدلتی رہے گی تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

۴۔ پرائیویٹ سیکٹر کو تسلیم کرنے اور انہیں دادِ تحسین دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ اگر گورنمنٹ کی طرف ایجوکیشن فنڈز بھی آتے ہیں تو انھیں بھی گورنمنٹ اداروں کے ساتھ مختص کردیا جاتا ہے اور پرائیویٹ سیکٹر کو بالکل نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں وسائل پیدا کرنے کے لیے پرائیویٹ سیکٹر کیسے گورنمنٹ کا ہاتھ بٹا پائے گا۔

۵۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی ہوم گراؤنڈ انڈسٹری کو تحفظ دیں، ان کی مدد کریں اور انھیں ٹیکس میں رعایت دیں۔

۶۔ وہ انڈسٹریز جن کا تعلق نالج بیسڈ اکانومی کے ساتھ ہے، اس کو مزید سپورٹ کریں۔

۷۔ بینکس کے ذریعے نوجوانوں کو intrest فری لون آسان اقساط پر مہیا کریں تاکہ قابل افراد کو وسائل میسر آسکیں اور وہ اپنی صلاحیتوں کو مزید بہتر انداز میں ملک و قوم کی خدمت میں صرف کر سکیں۔ پاکستان کے بنکس اپنے دروازے نوجوانوں کو قرض دینے کے لیے کھولیں۔ شوگر ملز اور سیاستدانوں کو قرضے دینے کے نتائج قوم دیکھ چکی ہے، اب ان نوجوانوں کو قرض دینا شروع کریں تاکہ یہ ملک و قوم کی خدمت کر کے دکھائیں۔ ہمارا مستقبل یہ نوجوان ہیں، ان کی صلاحیت ہے، ان کی تعلیم ہے، ان کا سکلز سیٹ ہے، ان پر invest کریں۔

۸۔ اپنے ملک کے ہیروز کو تسلیم کرنا اور ان کی خدمات کا اعتراف کرنا سیکھیں۔ جو قوم اپنے ہیروز کو تسلیم نہیں کرتی، وہ اقوام پھر ہیروز پیدا کرنا بند کر دیتی ہیں۔ ہزاروں لاکھوں باصلاحیت نوجوان اس ملک میں موجود ہیں جن کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تبھی ممکن ہوگا جب گورنمنٹ اور پرائیویٹ سیکٹر یکساں طور پر اس میں دلچسپی لیں گے۔ اگر ملک میں باصلاحیت افراد پیدا ہو ہی گئے ہیں تو پھر انھیں برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ یہاں جو اہل پیدا ہوتا ہے، پھر وہ پاکستان سے باہر جانے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ پاکستان میں اس کی صلاحیت کی قدر نہیں کی جاتی۔ ہم جب ان کی قدر یہاں کرنا سیکھیں گے، ان کی ضرورتوں کو اس ملک میں پوری کریں گے تو پھر یہ لوگ یہاں موجود رہیں گے اور جو صلاحیت اللہ تعالیٰ نے ان میں پیدا کی ہے، وہ ملک کی ترقی کے استعمال میں آئے گی۔ اگر ہم اسے یہاں برقرار نہیں رکھ پائیں گے تو یہی لوگ کسی اور ملک کی خدمت میں مصروف نظر آئیں گے۔ ایسا ماحول قائم کرنا اس ملک کے بڑوں کا کام ہے۔ کیا ہم چاہتے ہیں کہ یہ brain drain ہو جائے یا یہ retain کر لیا جائے اور یہ اس اور ملک کی خدمت میں مصروف ہو جائے۔ یہ فیصلہ آج کرنا ہے اور اس ملک کے بڑوں نے کرنا ہے۔

۹۔ کوالٹی گریجوایٹس پیدا کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔

۱۰۔ ٹیکنیکل ایجوکیشن، مینوفیکچرنگ سیکٹر اور Hitech انڈسٹری کی مینوفیکچرنگ کی طرف توجہ دی جائے تو پھر ملک کو ایک صحیح سمت ملے گی۔

نوجوان بامقصد زندگی گزاریں

نوجوانوں کے لیے پیغام یہ ہے کہ productivity یعنی کسی چیز کو بنانا کسی بھی قوم کا فخر ہوا

کرتا ہے اور ایسا تبھی ممکن ہوتا ہے کہ جب اس قوم کا رہنے والا باشندہ Productive ہو یعنی کچھ نہ کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ Productivity سائیکالوجی کے مطابق اس وقت تک نہیں بڑھتی جب تک زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو۔ بغیر مقصدیت Productivity اپنے کمال کو حاصل نہیں کرتی۔ مسلمان ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بہت اعلیٰ مقصد رکھا ہے۔ دوسری اقوام کے لیے تو شاید مقصد کو تلاش کرنا مشکل ہو لیکن مسلمان کے لیے اس مقصد کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مقصد بتایا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ (البقرہ، ۲: ۳۰)

”میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔“

انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ بہت بڑا مقصد دیا ہے کہ اگر بن سکتے ہو تو اتنا بلند ہو جاؤ کہ میری نیابت اور خلافت کی ذمہ داری ادا کرنے والے بن جاؤ۔ خلیفہ نائب یا وائس ایجنٹ کون ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت آقا علیہ السلام کی اس حدیث مبارک سے ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت سے متعلق پوچھا جائے گا۔ آدمی اپنے گھر پر نگران ہے اور اپنی رعیت کے متعلق جوابدہ ہو گا۔ عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد پر نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا، خادم اپنے مالک کے مال کا نگران ہے، اس سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ آدمی اپنے باپ کے مال کا نگران ہے، اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا اور ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (صحیح بخاری کتاب العتق، ۲: ۹۰۱، رقم: ۲۴۱۶)

اس حدیث مبارک میں حضور نبی اکرم ﷺ نے ”راعی“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ راعی چرواہے کو کہتے ہیں۔ گویا آقا علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ خلیفہ، نگہبان اور ٹرسٹی چرواہے کی مانند ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا چرواہا صرف بکریوں کو سنبھال کر رکھتا ہے؟ نہیں بلکہ وہ ان کا کامل نگران ہوتا ہے، وہ ان کی دیکھ بھال پر بھی توجہ دیتا ہے، ریوڑ کو بڑھانے پر بھی توجہ دیتا ہے، اگر ان میں سے کوئی جانور بیمار ہو جائے تو اس کی صحتیابی پر بھی توجہ دیتا ہے، ان کی خوراک پر بھی توجہ دیتا ہے، سردی گرمی یعنی موسم کے لحاظ سے بھی انھیں بچاتا ہے، درندوں اور چوروں سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یعنی صرف موجود اثاثے کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ اس کو بڑھاتا بھی ہے۔

اللہ رب العزت نے خلافت کے منصب کے ذریعے درحقیقت ہر انسان کو اس دنیا میں چرواہے کی

مانند بنایا ہے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ نے اس کائنات پر نگران بنایا ہے کہ جو کچھ اس نے تمھیں سونپا ہے، اسے صرف سنبھال کر نہ رکھو بلکہ اسے ترقی دو۔ اگر تمھیں ملک دیا ہے تو اسے ترقی دو۔۔۔ اگر تمھیں یہ کائنات سونپی ہے تو اسے ترقی دو۔۔۔ اسے ماحولیاتی آلودگی کے ساتھ برباد نہ کرو بلکہ اس کی حفاظت کرو اور نکھارو۔۔۔ الغرض جب دیئے گئے اثاثہ کی حفاظت بھی کرو گے، اس کو مزید بھی بڑھاؤ گے تب خلیفہ کہلوانے کے مستحق بنو گے۔

یاد رکھیں کہ صرف سنبھال کر رکھ لینا خلیفہ اور نائب کا کام نہیں ہوتا۔ کسی کمپنی کے بھی ٹرسٹی کی ذمہ داریوں میں فقط اثاثہ جات کو سنبھالے رکھنا نہیں ہے بلکہ اسے بڑھانا بھی اس کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ٹرسٹی کا درجہ دیا ہے، اس لیے اس دنیا کو ہم نے سنبھالنا بھی ہے اور اسے ترقی بھی دینی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ذمہ داری اور مقصد دیا ہے کہ خلیفہ ہونے کے ناطے ہمیں اپنا تمام تر کام ایمانداری اور عزت کے ساتھ کرنا ہے۔ اپنی integrity کو بھی متاثر ہونے سے بچانا ہے۔ حلال کمانا ہے اور حرام سے بچنا ہے۔ کبھی اپنے ضمیر پر سودا نہیں کرنا۔ کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کی طرف نہیں جانا۔ کبھی اپنی صلاحیتوں، ایجادات اور کامیابیوں کو کسی غلط آدمی کے ہاتھ نہیں چڑھنے دینا۔ اگر ایسا کر لیا تب حق ادا ہو گا اور وہ مقصد پورا ہو گا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے۔ گورنمنٹ نوکری ہو یا پرائیویٹ، ہمیشہ کرپشن سے دور رہیں۔ کرپشن آسان راستہ ہے لیکن کبھی بڑی منزلیں آسان راستوں پر چلنے والوں کو نہیں ملا کرتیں۔ بڑی منزل ہمیشہ اسی کو ملتی ہے جو راہِ عزیمت کا مسافر ہو اور جو اپنے لیے مشکل راستے کا انتخاب کرے۔

موجودہ دور میں کرپشن کر لینا بہت آسان ہے لیکن کرپشن سے بچے رہنا یہ سب سے مشکل کام ہے۔ ہم نے اس مشکل راستے کو چننا ہے لہٰذا اپنے ضمیر کو کبھی گدلا نہ ہونے دیں بلکہ اسے پاکیزہ رکھیں۔ حرام کے چار ٹکڑوں سے ایک دن کھانا زیادہ پک جائے گا لیکن اس سے ضمیر کی جو موت واقع ہو گی، اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ صرف کتابی بات نہیں ہے بلکہ مسلمان جب اپنے سنہری دور میں جیتے تھے تو لوگوں کی اکثریت ایسے ہوا کرتی تھی کہ وہ لوگ ضمیروں کا سودا نہیں کرتے تھے۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ خلیفۃ المسلمین تھے۔ آپ کے گھر ایک دفعہ رات کے وقت ایک وفد آگیا، اس وقت آپ نے چراغ روشن کر رکھا تھا۔ اس وفد کے ساتھ جب تک سرکاری باتیں ہوتی رہیں، چراغ جلتا رہا لیکن جب سرکاری باتیں ختم ہو گئیں اور ذاتی باتیں شروع ہو گئیں تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اس چراغ کو بجھا دیا اور اندھیرے میں باتیں کرتے رہے۔ اس وفد کے لوگوں نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا کیا؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ چراغ اور اس میں جلنے والا تیل سرکاری ہے جو ریاست

کے پیسوں سے لیا گیا ہے۔ جب تک تمہاری اور میری بات ریاست سے متعلق ہوتی رہی تو میرے لیے اس چراغ کا استعمال جائز تھا اور جب ہماری گفتگو کا موضوع تبدیل ہو گیا اور ذاتی باتیں شروع ہو گئیں تو میرے لیے حرام ہے کہ میں ریاست کا تیل اور چراغ استعمال کروں، اس لیے بجھا دیا۔

جب امت مسلمہ اور پاکستان میں ایسے ضمیر والے لوگ پیدا ہو جائیں گے، تب حقیقی معنی میں یہ ملک اور قوم بن جائے گی۔

اللہ رب العزت نے مسلمان کے ساتھ ایک خاص معاملہ فرمایا ہے کہ اس کے اندر اخلاقیات کو دیکھنے کا ایک پیمانہ رکھا ہے۔ اس کو ہر بات پر کسی عالمِ دین کے پاس جا کر فتویٰ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پیمانہ کسی میٹر کی طرح سب کچھ اسے بتا دیتا ہے کہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ ایسا کوئی انسان نہیں ہے کہ جسے یہ پتہ نہ چلے کہ وہ صحیح کر رہا ہے یا غلط؟ ہم نے صرف اس میٹر کی آواز سننی ہے جس سے ہم غلط اور صحیح میں فرق کر پائیں۔

آج کے نوجوان نسل کو ہیرو بننا ہو گا اور اپنے اندر موجود اس اخلاقیات جاننے والے میٹر کی آواز کو سنتے رہنا ہو گا تاکہ غلط اور صحیح میں فرق کا پتہ چل سکے اور حلال و حرام میں تمیز کر سکیں۔ اس راہ کے انتخاب میں بھلے زندگی مشکل ہو جائے لیکن اگر ہم کبھی سمجھوتہ نہیں کریں گے تو اس صورت وہ میٹر ہماری رہنمائی کرے گا اور تمام منازل آسان ہو جائیں گی۔ ہر انسان اپنے آپ کو اتنا اہل کر لے کہ وہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہونے کا حقدار بن جائے۔ یہ بہت بڑا مقصد ہے، اگر کوئی اسے حاصل کرے۔ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ شخص علم دین میں مہارت رکھتا ہو۔ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے کل کائنات میں جو شعبہ جات بھی رکھے ہیں، ان میں سے ہر شعبہ تبھی پروان چڑھے گا جب اس شعبے کے ماہرین ہوں گے۔ پس اللہ تعالیٰ کی خلافت کی ذمہ داری اس اخلاقیات کو جاننے والے میٹر کے ذریعے کسی بھی شعبے میں کی جا سکتی ہے۔ اس طرح ہر نوجوان نہ صرف اپنی زندگی کا ہیرو بن جائے گا بلکہ پوری قوم اور امت مسلمہ کا ہیرو بن جائے گا، بشرطیکہ مشکل راستے پر قائم رہے اور غلط کام سے رک جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و مددگار ہو، نوجوان نسل کی صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے اور انھیں ملک و قوم اور امتِ مسلمہ کا فخر اور حقیقی سرمایہ بنائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

پاکستان کا معاشی بحران اور ٹیکس سسٹم

ڈاکٹر علی اکبر الازہری

ملک و قوم کے دفاع، انتظامی امور کی تکمیل اور عوام کو سہولیات فراہم کرنے کے لیے دنیا کی ساری حکومتوں کو مختلف قسم کے محاصل (ٹیکس) کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ٹیکس ملکی معیشت کے لیے ناگزیر ہیں۔ ٹیکس کسی بھی مہذب معاشرے کے طرزِ حیات کی قیمت ہوتی ہے۔ شہریوں کو قابلِ عمل منصوبہ بندی اور معاشی و معاشرتی ترقی کے لیے ٹیکس ادا کرنا ہوتے ہیں۔ حکومتِ وقت مختلف طبقات، افراد، اشیائے خورد و نوش، کاروباری فرموں اور صنعتوں پر ٹیکس عائد کرتی ہے۔

اس حوالے سے یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ جبری اور ناروا نوعیت کے ٹیکس ریاستی معیشت کو کمزور کرتے ہیں۔ کیونکہ لوگ جبری ٹیکس اور ناجائز محصولات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ اس کے برعکس اگر حکومتِ وقت ٹیکس کی وصولی میں کمزور ہو تو امورِ مملکت کو رواں دواں رکھنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

ریاستی وسائل کی دستیابی کے لیے عہدِ نبوی ﷺ، خلفاء راشدین اور ان کے مابعد اسلامی حکومتوں میں بیت المال کا ادارہ قائم تھا جو ایک مربوط و منظم مالیاتی ادارے کا کام کرتا تھا۔ اس میں مختلف الانواع کے اموال مثلاً خمس غنائم، مالِ فئی، خمس معاون، خمس رکاز، خراج، جزیہ، ضواع (لاوارث مال)، زکوٰۃ اور صدقات وغیرہ جمع کیے جاتے تھے۔ لیکن فی زمانہ زکوٰۃ، عشر اور صدقہ و خیرات کے

علاوہ باقی وسائل اور اسباب ختم ہو گئے ہیں۔ اسی لیے حکومتی اخراجات اور دفاعی ضروریات کے پیشِ نظر ٹیکس کا نظام وضع کیا گیا ہے۔

ریاستی معیشت کے استحکام میں ٹیکس کی اہمیت

ٹیکس مختلف وجوہ کی اساس پر ملکی معیشت میں کلیدی کردار کے حامل ہوتے ہیں اور ملک کے شہریوں کی کاروباری سرگرمیوں پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ ریاستی مشینری اور ان کے روزمرہ معمولات بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کسی بھی ملک یا ریاست کے معاملات کو چلانے کے لیے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سرحدوں کی حفاظت، ملکی افواج کے اخراجات، انتظامی مشینری کو مراعات اور وظائف، زراعت و آبپاشی کے لیے نہروں کی تعمیر، تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں کا قیام، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر و مرمت، معاشرے کے پسماندہ اور معذور افراد کی بحالی اور اعانت وغیرہ شامل ہیں۔

دورِ حاضر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا سماجی و معاشی ترقی کو صرف اور صرف قابل عمل ٹیکس پالیسی ہی سے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ اسی لیے حکومتیں ان کے متعلق مالیات کا ہدف پورا کرنے کے لیے عوام اور کاروباری سرگرمیوں پر ٹیکس عائد کرتی ہیں۔ اسی بنا پر ٹیکس کو کسی ملک یا ریاست کے سماجی منصوبہ جات کے لیے بہت ہی اہم خیال کیا جاتا ہے۔

اگر ٹیکس کی شرح بہت زیادہ ہو تو یہ ملکی امور، بچت، سرمایہ کاری، کاروبار کے نئے مواقع اور کئی دیگر چیزوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ معاشی نظریات یہ عندیہ دیتے ہیں کہ ٹیکس پالیسی کی تبدیلی سے معیشت میں بھی تبدیلی جنم لیتی ہے۔ ٹیکس کی عدم وصولی یا اخراجات کی نسبت کم حاصل ہونے کی صورت میں ملکی معیشت عدمِ استحکام کا شکار ہو سکتی ہے۔

معیشت کو دیرپا اور مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ٹیکس کے علاوہ دیگر اقدامات بھی اٹھانے ضروری ہیں۔ حکومتِ وقت کا فرض ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے، جس سے معیشت میں ترقی ہو اور ایسی اصلاحات کا نفاذ عمل میں لائے جس سے معیشت و معاشرت کا پہیہ مستقل اور پائیدار بنیادوں پر استوار ہو کر رواں دواں ہو جائے۔ علاوہ ازیں ملکی معیشت کے استحکام کے لیے بنیادی حقوق کے نفاذ کو یقینی بنانا بھی وقت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ بنیادی حقوق کے تحفظ سے ہی معاشی مضبوطی اور پائیداری جنم لیتی ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد آپ ﷺ نے اولین اسلامی ریاست میں بنیادی حقوق کی مکمل ضمانت فراہم کی۔ دولت کی منصفانہ تقسیم اور معاشی انصاف کے

لیے خاطر خواہ انتظامات کیے۔ معاشی اونچ نیچ اور ظلم و جبر کی بیخ کنی کے لیے سود خوری، ذخیرہ اندوزی، قمار بازی، غصب اور دیگر ناجائز ذرائع کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ معاشی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے آزاد معیشت کا ماحول پیدا کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ پابندیاں عائد کر کے حلال و حرام کا تعین بھی کیا گیا۔ سودی معاملات کی سختی سے ممانعت کر دی گئی اور اسے قابل سزا جرم قرار دیا گیا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(آل عمران، ۳: ۱۳۰)

”اے ایمان والو! دو گنا اور چوگنا کر کے سود مت کھایا کرو، اور اللہ سے ڈرا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

اسلام کے اقتصادی نظام نے مالی ترقی اور اخلاقیات میں توازن پیدا کیا ہے۔ اس میں نہ تو خالص مادہ پرستی کا رجحان ہے اور نہ کلی رہبانیت ہے۔ بیروزگاری اور افلاس ایسے مسائل ہیں جو معاشرے کی ترقی میں حائل ہونے کے علاوہ عوام کی اخلاقیات پر بھی منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے حضور نبی اکرم ﷺ نے محتاجی سے پناہ مانگتے ہوئے دعا فرمائی:

اللھم انی اعوذبك من الکفر والفقر وعذاب القبر۔ (نسائی، السنن الکبریٰ، کتاب السھو، باب تعوذ فی دبر الصلوۃ، رقم الحدیث: ۱۳۴۷)

اے اللہ! میں کفر اور محتاجی اور عذابِ قبر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

معاشی استحکام کو یقینی بنانے کے لیے حضور نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ مختلف پیشوں اور صنعتی سرگرمیوں میں مصروف ہوں تاکہ معیشت کو فروغ حاصل ہو۔

ٹیکس کے نفاذ کے مقاصد

محصولات لگانے سے قبل حکومتِ وقت کو چاہیے کہ عوام الناس کو آگاہ کرے کہ فلاں ٹیکس کس مقصد کے لیے لگایا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماءِ اسلام نئے ٹیکس کے اجراء کے لیے شریعت کے متعین کردہ مقاصد کو واضح کرنا حکومت کی ذمہ داری میں شمار کرتے ہیں۔ فقہاءِ اسلام کے اجماع کی روشنی میں حکومت کو زکوٰۃ، عشر اور خمس کے علاوہ بھی ٹیکس لگانے کا حق حاصل ہے مگر اس کے لیے مقاصد کا تعین ضروری ہے۔ حکومت جو بھی ٹیکس لگانا چاہے اس کے مقاصد عوام پر واضح کرے۔ اگر مقاصد عوام کی فلاح و خیر خواہی پر مبنی ہوں گے تو وہ کسی قسم کا ٹیکس ادا کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے اور اگر

انہیں ٹیکس کے مقاصد کا ہی علم نہ ہو یا ان کے مقاصد غیر اسلامی اور عوام کے خلاف ہوں تو وہ نہ صرف ان ٹیکسوں کی چوری کریں گے بلکہ حکومت کے خلاف ان کے جذبات بھی بھڑک اٹھیں گے۔

اکثر مسلم ماہرینِ معیشت کہتے ہیں کہ چونکہ اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے۔ لہٰذا وہ ٹیکس عائد کرنے کی مجاز ہے۔ لیکن ٹیکس کی وصولی کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ناگزیر حالات میں اس کی ضرورت ہو اور اس کے اطلاق کی مدت یکساں ہوں۔ ٹیکس صرف اسی صورت میں وصول کیا جائے جب حکومتِ اسلامیہ کے مقاصد کی اس سے تکمیل ہوتی ہے۔ ٹیکس شہریوں کی استطاعت کے مطابق اور انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہو۔ اس سلسلے میں عوام کو سہولت دی جائے اور ان پر کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے۔ اس کے خرچ کرنے میں اصولِ کفایت یا اصولِ اقتصاد کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اسی لیے صاحبانِ اقتدار اور ملکی باگ ڈور پر مسلط افراد کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ ٹیکس کا نفاذ کرتے وقت عدل و انصاف اور عوام الناس کی معاشی حالت کو مدِ نظر رکھیں۔ اس سلسلے میں ٹیکس کا تعین کرتے وقت اسلامی تاریخ کی نظائر اور امثال کو مدِ نظر رکھنا آسانی کا راستہ مہیا کر سکتا ہے۔ انہیں چاہیے کہ رعایا کو اعتماد میں لیتے ہوئے ٹیکس کی آمدنی کو صحیح اور متعین جگہ پر صرف کریں۔

کسی بھی ملک یا ریاست میں ٹیکس لگانے کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب ریاستی معاملات کی انجام دہی کے لیے مالی وسائل درکار ہوں۔ لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے شہریوں پر ٹیکس عائد کرنے سے قبل ان مقاصد کا تعین کرنا نہایت ضروری ہے، جس مقصد کے لیے محصولات وصول کیے جانے ہیں۔ اس کا مثبت نتیجہ یہ نکلے گا کہ عوام خوشدلی اور رضا و رغبت سے ٹیکس ادا کریں گے۔ ایک اسلامی ریاست کے مالیاتی نظام میں ٹیکس کے نفاذ لیے درج ذیل مقاصد کو متعین کیا جاتا ہے:

ا۔ ملک کے شہریوں کے لیے روحانی اور مادی ترقی کا حصول یکساں طریق پر ہو۔ وہ اپنی معاشی جد وجہد اور وسائلِ رزق کے ذریعے نہ صرف دنیوی زندگی میں بہرہ ور ہو سکیں بلکہ سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے اخروی فلاح کی تیاری بھی کر سکیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ (القصص، ۲۸: ۷۷)

”اور تو اس (دولت) میں سے جو اللہ نے تجھے دے رکھی ہے آخرت کا گھر طلب کر، اور دنیا سے (بھی) اپنا حصہ نہ بھول۔“

اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ جب وہ ٹیکس کا تعین کرے تو عوام الناس کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کا خیال رکھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ محصولات (ٹیکس) کی بھرمار سے ان کے ذہنی سکون کو برباد کرے اور معاشرتی زندگی میں اضطراب پیدا ہو جائے۔

۲۔ ٹیکس کے نفاذ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ دولت کی تقسیم منصفانہ طریقے سے ہو۔ اگرچہ اسبابِ معیشت سب انسانوں کو برابر میسر نہیں ہوتے لیکن اسلامی ریاست ایسے اقدامات کرے کہ جس سے امراء کی دولت کا کچھ حصہ غرباء تک پہنچ جائے۔ جیسا کہ اسلام نے زکوٰۃ اور صدقات کا مستحسن نظام قائم کیا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ۔ (الحشر، ۵۹: ۷)

”(یہ نظامِ تقسیم اس لیے ہے) تاکہ (سارا مال صرف) تمہارے مالداروں کے درمیان ہی نہ گردش کرتا رہے (بلکہ معاشرے کے تمام طبقات میں گردش کرے)۔“

۳۔ ٹیکس کے نفاذ کا تیسرا بڑا مقصد قیمتوں کو عادلانہ سطح پر رکھنا ہے۔ مہنگائی اور گرانی کے انسداد کے لیے حکومتِ وقت اپنی پوری سعی کرے تاکہ اشیاء خورد و نوش کی قیمتیں ایک قابلِ قبول سطح پر برقرار رہیں۔

۴۔ تجارتی چکروں (Trade cycle) کا انسداد بھی ٹیکس کے نفاذ کا ایک اہم مقصد ہے۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک اقتصادی ماہرین تجارتی چکروں کے حق میں تھے۔ تجارتی چکروں کا مطلب ہے کہ پوری دنیا میں عام طور کسی ملک یا علاقے میں بالخصوص ہر آٹھ یا دس برس کے بعد معاشی لحاظ سے خوشحالی دور دورہ ہوتا ہے اور سرمایہ کاری اور تجارت کافی عروج پر چلی جاتی ہے۔ بعد ازاں بے روزگاری، تجارتی خسارہ اور سرمایہ کاری میں زبوں حالی عود آتی ہیں۔ ایک اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ تجارتی چکروں کا انسداد اور پیشگی تدارک کرنے کے لیے مناسب اقدامات کرے تاکہ معاشی بدحالی اور کساد بازاری سے بچا جا سکے۔ اگر ایسے حالات کبھی پیدا ہو جائیں تو اسلامی حکومت غریبوں اور محتاجوں کی کفالت کا بندوبست کرے۔

اسلام میں ٹیکس لگانے کی شرائط

ایک اسلامی ریاست میں ٹیکس کن حالات میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی چار شرائط ہیں:

۱۔ دفاعی، ترقیاتی اور سماجی لحاظ سے حقیقی عوامی ضرورت درپیش ہو اور اس ضرورت کو اس متعلقہ شعبے کے ماہرین کی سند اور تائید حاصل ہو۔

۲۔ جب دوسری تمام معاشی ذمہ داریاں اس ضرورت کو پورا کرنے میں ناکام ہو جائیں۔ ایسا کرنے کے لیے زکوٰۃ اور خراج وصول کیا جائے اور بعد ازاں اس ضرورت کے لیے ٹیکس لگایا جائے۔

۳۔ ٹیکس کو اس ضرورت کی حد تک رکھا جائے، جونہی یہ اس ضرورت سے بڑھ جائے تو اسے ممنوع قرار دیا جائے۔

۴۔ اولاً متمول اور صاحبِ ثروت لوگوں پر ٹیکس عائد کیا جائے اور اس سلسلے میں عدل وانصاف سے کام لیا جائے، کسی قسم کا امتیاز روانہ رکھا جائے۔ ٹیکس نقدی یا پیداواری شکل یا زمین کی صورت میں وصول کیا جاسکتا ہے۔

ان شرائط سے واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ اور خراج کے علاوہ ٹیکس لگانے کی نوبت آجائے تو اولاً ماہرین سے مشاورت کی جائے اور جس مقصد کا تعین کیا گیا تھا، صرف اسی مقصد کی حدود میں رہ کر ان محصولات کو صرف کیا جائے۔ پہلی صدی ہجری میں جب اسلام ایک بڑی سیاسی قوت بن کر عالمِ شہود میں آیا تو مفتوحہ علاقوں میں ظالمانہ ٹیکسز کو فوری طور پر ختم کر دیا گیا بلکہ اس کی بجائے اسلام نے عدل وانصاف پر مبنی ٹیکس کا نفاذ کیا۔ اس نظام میں ٹیکس دہندگان سے حسنِ سلوک کرنے، کسی قسم کے جبر سے اجتناب کرنے، ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے اور کسی قسم کا تشدد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں عہدِ نبوی ﷺ، خلافتِ راشدہ، اموی اور عباسی دور کی نظائر تاریخ کی کتب میں مرقوم ہیں۔

پاکستان میں ٹیکس کی عدم ادائیگی کے اسباب

ٹیکس پاکستانی معیشت کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ یہ معاشی ترقی اور سماجی فلاح کے پروگرامز کے لیے معاون ہوتے ہیں۔ مختلف چیلنجز اور مشکلات کے باوجود پاکستان کے ٹیکس کے نظام کے لیے بڑے مواقع ہیں۔ ان میں ٹیکس اصلاحات، ڈیجیٹل ورک اور بین الاقوامی تعاون وغیرہ شامل ہیں۔ اس وقت پاکستان کو ٹیکس چوری، بلند شرح ٹیکس اور ٹیکس کے نظام کی پیچیدگی جیسے مسائل درپیش ہیں۔ سیاسی و معاشی افراتفری کے موجب پاکستان کی معیشت نے ایک Drip Economy کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ سیاسی کشمکش اور بلند ترین مہنگائی کی شرح نے ملک کو نازک موڑ پر لا کھڑا کر دیا ہے۔

پاکستان میں معیشت کے عدمِ استحکام کا بڑا سبب ٹیکس ادائیگیوں کی وصولی میں ناکامی اور ملک کی بڑی آبادی کا براہِ راست ٹیکس ادا نہ کرنا ہے۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو (FBR) جو ملکی ٹیکس جمع کرنے کا بڑا اور اہم ادارہ ہے۔ سیاسی مداخلت اور بدعنوانی کے سبب اپنے متعینہ ہدف میں ناکام ہو چکا

ہے۔ پاکستان کا ٹیکس سسٹم اتنا پیچیدہ ہے کہ وہ عام آدمی کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس وقت تقریباً بلاواسطہ اور بالواسطہ کئی ٹیکس ملک کے شہریوں پر عائد کیے گئے ہیں۔ ٹیکس کی اتنی بہتات اور بھرمار نے انہیں پیچیدہ اور مشکل بنادیا ہے۔

معیشت کے استحکام کے لیے ٹیکس کا نظام وسعت کا حامل اور ہمہ گیر ہونا چاہیے۔ لیکن پاکستان میں ٹیکس گریز رجحانات، غیر دستاویزی معیشت کا پھیلاؤ اور بنیادی اصلاحات سے اعراض کی وجہ سے پچیس کروڑ کی آبادی میں ٹیکس دہندگان کا تناسب بہت کم ہے۔ گزشتہ سال آئی ایم ایف نے دیگر شرائط کے ساتھ ٹیکس کی وصولی میں اضافے کی شرط عائد کردی تاکہ تجارتی خسارے کا مداوا کیا جاسکے۔ لیکن بد قسمتی سے ٹیکس کی وصولی میں بالواسطہ ٹیکسوں کی بھرمار سے غریب اور متوسط طبقے پر اس کا بہت زیادہ بوجھ پڑا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ عصر حاضر میں مختلف ٹیکس اور ان کی شرح بعض اوقات ظالمانہ حد تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر مزید اس پر ظلم یہ کہ ٹیکس کی وصولی کے بعد اس میں بے جا تصرف اور ناموزوں جگہ پر خرچ کیا جاتا ہے۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں عالمی مالیاتی اداروں کی ایما پر مختلف مدات میں بہت زیادہ شرح ٹیکس عائد کی جاتی ہے۔

بد قسمتی سے پاکستان میں ٹیکس کو روایتی طور پر منفعت بخش کام کی بجائے ایک بوجھ تصور کیا جاتا ہے۔ جزوی طور پر یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں ٹیکس کا نظام پیچیدہ اور مشکل ہے جسے عام شہری سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ پاکستان میں ٹیکس کی ادائیگی کا بوجھ غریب اور متوسط طبقے پر ڈالا جاتا ہے۔ محصولات کے عدمِ توازن اور مناسب منصوبہ بندی کے فقدان نے ملک کو گھمبیر مسائل سے دوچار کردیا ہے۔

اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کہ اس وقت پاکستان بہت بڑے معاشی بحران سے گزر رہا ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ دو عوامل یعنی ٹیکسوں کی مد میں موصول ہونے والی رقم اور ملکی برآمدات معیشت میں خون کی روانی کا کام کرتی ہیں۔ جس طرح انسانی جسم میں خون کا دباؤ مناسب ہو تو وہ صحت مند شمار ہوتا ہے، ایسے ہی یہ دو ذرائع معاشی زندگی کے لیے روحِ رواں ہیں۔ علاوہ ازیں پاکستانی معیشت میں درآمدات بھی عدمِ تحفظ کا شکار ہیں۔ کیونکہ مستحکم اور دیرپا معیشت کے لیے برآمدات کی شرح درآمدات سے تین گنا زیادہ ہونی چاہئیں۔ گزشتہ سال سٹیٹ بنک کے زرمبادلہ کے ذخائر چار اشاریہ پانچ ملین ڈالر تھے جو بمشکل ایک مہینے کی درآمدات کا احاطہ کرسکتے تھے۔ نتیجتاً روپے کی قدر اکیاسی فیصد سے کم ہوگئی۔ بیرونی قرضوں کی حد ایک سو

اٹھائیس بلین ڈالر تک جا پہنچی ہے جو کہ ہماری مجموعی ترقیاتی پیداوار (جی ڈی پی) کا تینتالیس فیصد ہے۔ پچھلے آٹھ سالوں میں بیرونی قرضوں کا حجم دوگنا ہو چکا ہے۔ فی الوقت مہنگائی کی شرح گزشتہ تین ماہ سے اٹھائیس فیصد زیادہ ہے۔

پاکستان کی موجودہ حکومت گزشتہ نو دس مہینوں سے روزانہ تیرہ ارب روپے کے نئے قرضے حاصل کر رہی ہے۔ جس سے آمدنی اور اخراجات کا توازن بگڑ گیا ہے۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو کو فی الحال اپنے ٹیکس کے ہدف کی تکمیل کے لیے قریباً تین سو ارب کے خسارے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جس میں ایک تخمینے کی رو سے آئندہ آنے والے مہینوں میں اضافہ متوقع ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ٹیکس کے نظام کا مؤثر نہ ہونا اور ٹیکس چوری ان چند اساسی نوعیت کے اسباب اور بڑی وجوہات میں سے ہیں، جن کی وجہ سے وطن عزیز پاکستان ترقی یافتہ اور خوشحال مملکت نہیں بن سکا۔ پاکستان میں ٹیکس کی وساطت سے اکٹھی ہونے والی رقم عوامی فلاح و بہبود، ترقیات اور تعلیم پر سب سے کم ہے جو کہ ایک المیہ سے کم نہیں۔ پاکستان میں مالیات کا نصف یعنی پچاس فیصد بیرونی قرضوں اور سود کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے۔ بیس فیصد سرکاری ملازمین کی مراعات، تنخواہوں اور ریٹائرڈ ملازمین کی پنشن پر صرف ہوتا ہے۔ بیس فیصد دفاعی اخراجات پر خرچ ہوتا ہے جبکہ عام آدمی کے لیے دس فیصد رقم بچتی ہے۔

معاشی بحران کا ایک سبب ٹیکس کی عدم ادائیگی ہے

پاکستان میں اقتصادی بحران کی وجوہات میں حکومتی و انتظامی مشینری کی نااہلی و بدعنوانی، سماجی شعبہ جات کی مجرمانہ غفلت، ٹیکسیشن کا مناسب بندوبست نہ ہونا اور اندرونی و بیرونی قرضوں کی گھمبیر صورتحال ہے۔ پاکستان میں معاشی انتظام انصرام اس قدر دگرگوں ہے کہ معیشت ایک مالیاتی بحران سے دوسرے مالیاتی بحران کی طرف چلی جاتی ہے۔ اس گھمبیر مسئلہ کا بنیادی سبب حکمرانوں کا قومی خزانے کو غیر ذمہ دارانہ طریقے سے استعمال کرنا اور ریاست کے اقتصادی معاملات میں کچھ انتظامی مسائل کا سامنے آنا ہے۔ جس کے موجب ملک پاکستان میں معاشی عدم استحکام، مہنگائی، آسمان کو چھوتی ہوئی قیمتیں، ناقص عوامی خدمات، وسیع پیمانے پر بدعنوانی، غربت، بجلی کی لوڈ شیڈنگ اور سماجی شعبہ جات کی مجرمانہ لاپرواہی اور بڑھتے ہوئے ملکی قرضے تصویری خاکہ پیش کرتے ہیں۔

پاکستان میں عوام الناس کا ٹیکس سے اعراض اور بے اعتنائی کا رویہ، ان کا سرکاری محکمہ جات پر اعتماد کا فقدان، کمزور اور غافل انتظامیہ، محکمہ ٹیکس کی بدعنوانی، غیر رسمی سیکٹرز، نقد معیشت کا نمایاں

ہونا، محصولات کے نفاذ کا ناقابلِ عمل اور کمزور طریقِ کار، ٹیکس چھپانے کا رجحان، اعداد و شمار کی کمی، ٹیکس آڈٹ کا مسئلہ وغیرہ ریونیو کے اہم ترین مسائل ہیں۔ پاکستان میں ٹیکس پالیسی اور ٹیکس انتظامیہ کو بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ ٹیکس کی شرح کو مناسب حد میں رکھ کر اور ٹیکس کی ناجائز رعایت کو ختم کرکے ٹیکس کی مد میں اضافہ کرنے کی شدید اور ناگزیر ضرورت ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ملکی معیشت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے بدعنوان اور تساہل پسند انتظامیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ یہ چیلنجز ملک پاکستان کو طویل عرصے سے درپیش ہیں اور ٹیکس اصلاحات میں بھی یہی عوامل رخنہ ڈالے ہوئے ہیں۔

دنیا میں ٹیکس کا نفاذ قانونی و اخلاقی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہر شہری سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ قانون کا احترام کرتے ہوئے ان کی پوری اور بروقت ادائیگی کرے۔ تاہم یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ پاکستان دنیا کے ایسے ممالک کے زمرے میں آتا ہے جہاں پر معیشت کے اعتبار سے محصولات کی وصولی کم ہے۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے اخراجات اور ذمہ داریاں ٹیکس کی وصولی کے مقابل کہیں زیادہ ہے۔ ایک عام آدمی حکومت پر عدمِ اعتماد کرتے ہوئے ٹیکس کو ادا کرنے میں لیت و لعل سے کام لیتا ہے اور اس کے متعلق دیئے گئے حکومتی احکامات سے انحراف کرتا نظر آتا ہے۔ ایک مثالی ریاست میں حکومت سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ اس کے ٹیکس کے ادارے دیانتدار اور فرض شناس ہوں لیکن ہمارے ہاں صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔

اسلامی مالیاتی نظام میں محصولات (ٹیکس) کے اصول

اسلامی مالیاتی نظام میں زکوٰۃ و صدقات اور ہنگامی محصولات (ٹیکس) کے سلسلہ میں درج ذیل چار اصول نمایاں اہمیت کے حامل ہیں:

ا۔ ایمان اور عقیدہ کا تحفظ

اسلامی ریاست میں ایک مسلمان زکوٰۃ، عشر وغیرہ کی ادائیگی ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر خوشنودی باری تعالیٰ کے لیے کرتا ہے۔ وہ بعض ٹیکس محض اس لیے ادا کرتا ہے تاکہ اس کے ایمان اور عقیدہ کی حفاظت ہو۔ بعینہ اسلامی ریاست میں موجود غیر مسلم رعایا بھی جزیہ اور خراج محض اس لیے ادا کرتے ہیں تاکہ انہیں اپنے عقیدے پر عمل کرنے کے لیے ریاستی تحفظ حاصل ہو۔

۲۔ اقتصادی اور سماجی ضروریات

اسلام کے نظامِ اقتصاد میں ٹیکس کے نفاذ کا مقصد وحید معاشی اور معاشرتی ضروریات کو کماحقہ

پورا کرنا ہوتا ہے۔ اسلام اس چیز کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جائے۔ اسلام ان کی وساطت سے معاشرے میں موجود معاشی اور معاشرتی فرق کا خاتمہ کرتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے زکوٰۃ کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ان اللہ افترض علیھم صدقۃ فی اموالھم توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم۔ (صحیح البخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ، رقم الحدیث: ۱۳۹۵)

بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال میں صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے جو کہ ان کے مالداروں سے لے کر ان کے غریبوں میں لوٹایا جائے۔

۳۔ اصولِ مساوات

اسلام کے معاشی نظام میں اصولِ مساوات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ملک کے تمام شہریوں پر بلا لحاظ مذہب و نسل ٹیکس کا اجرا کیا جاتا ہے۔ تجارت کے فروغ اور معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ عشر میں مساوات کے اصول کو مد نظر رکھتے تھے تاکہ آسانی بھی پیدا ہو اور محصول بھی وافر مقدار میں جمع ہو جائے۔ ابو عبید القاسمؒ لکھتے ہیں:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نبطیوں سے تیل اور گندم پر نصف عشر یعنی بیسواں حصہ وصول کرتے تھے تاکہ مدینہ منورہ میں زیادہ مقدار میں عشر پہنچے اور دوسری اجناس پر عشر (دسواں حصہ) لیتے تھے۔ (ابو عبید القاسم، کتاب الاموال، ص: ۵۳۳)

ٹیکس کے نفاذ میں رعایا کی رضامندی کو پیشِ نظر رکھنا لازمی ہے۔ جیسا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں فرمایا:

وان لایوخذ منهم الا فضلهم عن رضاهم۔ (صحیح بخاری، کتاب اصحاب النبی ﷺ، باب قصہ البیعہ والاتفاق علی عثمان بن عفان، رقم حدیث: ۳۷۰۰)

ان کی رضامندی سے ان کے مال سے اتنا ہی لیا جائے جو ان کی ضروریات سے زائد ہو۔

۴۔ اصول تیقن

ٹیکس کی وصولی میں تیقن کے اصول کو اختیار کیا جائے۔ جو ٹیکس عائد کیے جائیں ان کی قانونی حیثیت، وقتِ ادائیگی اور مقدار کا ٹیکس گزاروں کو علم ہونا چاہیے۔ زکوٰۃ، خراج، جزیہ اور عشور میں یہ اصول بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

۵۔ ٹیکس کی وصولی میں نرمی اور سہولت

ٹیکس کی وصولی میں سہولت کو مدنظر رکھا جائے۔ اس سلسلے میں عادلانہ تشخیص اور وصولی کا بندوبست کیا جائے۔ جیسا کہ حکم ربانی ہے:

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ (البقرہ، ۲: ۲۷۹)

”(اِس صورت میں) نہ تم خود ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔“

زکوٰۃ اور خراج کی وصولی میں انصاف اور نرمی کرنے والے کو فی سبیل اللہ جہاد کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ ہے:

العامل اذا استعمل فاخذ الحق واعطی الحق لم یزل کالمجاھد فی سبیل اللہ حتی یرجع الی بیتہ۔ (المنذری، جلد اول، ص ۳۱۵، رقم حدیث: ۱۱۵۹)

جب ایک شخص کو عامل (Collector) مقرر کیا جاتا ہے۔ پس وہ حق کے ساتھ وصول کرتا ہے اور حق کے ساتھ ہی دیتا ہے تو وہ راہ خدا میں مجاہد کی مانند ہے یہاں تک کہ وہ اپنے گھر واپس لوٹ آئے۔

محصول کی ادائیگی میں سہولت مہیا کی جائے۔ اسلام آسانی اور سہولت کا دین ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یسروا ولا تعسروا وسکنوا ولا تنفروا۔

(صحیح البخاری، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا، رقم حدیث ۶۱۲۵)

آسانی کرو، سختی نہ کرو، لوگوں کو تسلی اور تشفی دو اور نفرت پیدا نہ کرو۔

عوام الناس سے ایسا محصول ہر گز نہ لیا جائے جو ان پر واجب الادا نہ ہو چنانچہ امام ابو یوسف کتاب الخراج میں رقمطراز ہیں:

لایظلموا ولا یوذوا ولا یکلفوا فوق طاقتھم ولا یوخذ شیء من اموالھم الا بحق یجب علیھم۔ (ابویوسف، کتاب الخراج، ص ۱۳۸)

ان پر ظلم نہ کیا جائے، نہ انہیں تکلیف دی جائے، نہ ان کی طاقت سے بڑھ کر بار ڈالا جائے، ان کے اموال سے کوئی چیز نہ لی جائے، جو ان پر واجب نہ ہو۔

۶۔ زائد از ضرورت مال پر ٹیکس

ضرورت سے زائد مال و دولت پر محصول عائد کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (البقرہ،۲: ۲۱۹)

’’اور آپ سے یہ بھی پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں؟ فرما دیں جو ضرورت سے زائد ہے (خرچ کر دو)۔‘‘

۷۔ اصولِ کفایت

ٹیکس کا نفاذ اور وصولی اس انداز سے کی جائے کہ حاصل شدہ رقم حکومتی اخراجات کی کفایت کر سکے۔ جس مقصد کی خاطر ٹیکس وصول کیا جائے، اسی مقصد کے لیے اسے استعمال کیا جائے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

الجبایه بالحمایه۔ (شامی، ابن عابدین، حاشیہ ردالمختار، ج ۲، ص ۳۹) محصول حفاظت کرنے پر ہیں۔

معاشرتی و معاشی حالات کے پیشِ نظر ریاست محصول عائد کر سکتی ہے تاکہ معیشت کو استحکام حاصل ہو اور ملکی نظم و نسق کو کماحقہ اور احسن طریقے سے چلایا جاسکے۔ ایسے حالات میں محصولات لگائے جاسکتے ہیں جب متمول افراد اپنی دولت کو محض عیش و عشرت اور فضول خرچیوں پر اڑا رہے ہوں۔ امراء کی وہ دولت جو اگرچہ انہوں نے جائز ذرائع سے حاصل کرلی ہے لیکن اس دولت کو وہ فضول اور شاہ خرچیوں میں اڑا رہے ہیں جو کہ اسلام کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ حکومتِ وقت چاہے تو ان کی اس دولت پر ٹیکس عائد کر کے ان کے اسراف کا تدارک کر سکتی ہے۔

عدل وانصاف پر مبنی حکومت کا نصب العین ہی اپنے عوام کی فلاح و بہبود اور خدمت ہوتا ہے۔ اسی لیے عادل حکمران ملکی خزانہ فلاحی کاموں اور مفلسوں اور ضرورت مندوں کی داد رسی اور خدمات کے لیے صرف کرتے ہیں۔ وہ بے جا اور ناجائز ٹیکس سے عوام الناس کو پریشان نہیں کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جبر و ستم کی حکومت کا مقصد صرف اور صرف حکمرانوں کے اقتدار اور عیش و عشرت کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ انہی پالیسیوں کی بدولت اس ملک کی عوام ہمیشہ ٹیکس کے انبار تلے دب کر رہ جاتی ہے اور اکثریت کو مفلس و غریبی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

استحکامِ پاکستان کے تقاضے

محمد علی قادری

آج وطن عزیز پاکستان کو آزاد ہوئے 77 سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ پوری قوم ہر سال جشن آزادی جوش و خروش سے مناتی ہے۔ اس پر مسرت موقع پر پورے ملک میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ سرکاری عمارات کو بالخصوص برقی قمقموں سے سجایا جاتا ہے۔ پرچمائی کشائی کی جاتی ہے۔ سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں لیکن ہماری یہ تمام خوشیاں اس وقت بے رنگ اور بے معنی دکھائی دینے لگتی ہیں جب ہم اپنے وطن کا حال دیکھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بطورِ قوم آزادی کے رنگوں میں وطن کی تعمیر و ترقی اور خوش حالی کے رنگ بھی شامل کریں اور قیام پاکستان کے اساسی فکر و نظریہ کو نوجوانوں کے قلب و ذہن میں جاگزیں کریں۔ اس حوالے سے چند معروضات نذرِ قارئین ہیں۔

قیام پاکستان کی اساس

پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے جس کی اساس دو قومی نظریہ ہے۔ یہ وہی دو قومی نظریہ ہے جو ریاست مدینہ کے قیام کی بنیاد بنا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے 1944ء میں اسی دو قومی نظریہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا:

"پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔"

قائدِ اعظم کی دور بین نگاہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم کی تفریق کا بغور جائزہ لے چکی تھی۔ چونکہ آپ مسلم لیگ میں شمولیت سے قبل سیاسی طور پر کانگریس میں رہ چکے تھے، اس لیے آپ جان چکے

تھے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم الگ الگ نظریات کی حامل دو قومیں ہیں۔ ان کی بود و باش، طرزِ معاشرت، معیشت اور مذہبی اقدار و روایات بالکل مختلف ہیں۔ مسلمانوں کی اپنی تاریخ ہے جس کی بنیاد ریاستِ مدینہ سے ملتی ہے اور ہندوؤں کی الگ تاریخ ہے جو اگرچہ قدیم ہے مگر اس کی مسلمانوں کی تاریخ سے کوئی ہم آہنگی نہیں۔ قائداعظم کانگریس کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ برا سلوک بھی دیکھ چکے تھے۔ سو انہیں شرح صدر تھا کہ ہندو کسی بھی طور مسلمانوں کو آزادی سے زندگی گزارنے نہیں دیں گے۔ یہی فکر و فلسفہ قیامِ پاکستان کی بنیاد تھا اور اس کا تصور شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے 1930ء میں الٰہ آباد کے خطبہ میں پیش کیا۔ علامہ محمد اقبالؒ کے نزدیک برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ ان کے لیے الگ مملکت قائم کر دی جائے کیونکہ دونوں اقوام کا یکجا رہنا ناممکن ہے۔ یہ دونوں قومیں اکٹھے رہنے کے باوجود الگ الگ ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کا الگ ملک ہونا چاہیے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری اپنی کتاب ''اقبال کا خواب اور آج کا پاکستان'' میں کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کا خواب درحقیقت اس عظیم خواب کا تسلسل تھا جس کی ابتدا عہدِ نبوی ﷺ میں ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں کچھ لوگ حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے بغیر کسی تعارف کے فرمایا کہ تم لوگ سندھ سے آئے ہو؟ جس کا مطلب تھا کہ آپ کی اس سرزمین کی طرف توجہ تھی۔ آپ نے چند صحابہ کو ان کے ہمراہ تبلیغ اسلام کے لیے روانہ فرمایا۔ پھر ۱۶/۱۵ ہجری میں عہد فاروقی میں اس خطے کی سرحدیں اسلامی ریاست کے ساتھ ملا دی گئی تھیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں ۴۲ھ میں اسلامی افواج لاہور تک پہنچ چکی تھیں۔ بلوچستان، قندھار، مکران اور گرد و نواح کے علاقے فتح ہو کر اسلامی ریاست کا حصہ بن چکے تھے۔ ۹۲ ہجری میں جب محمد بن قاسم آئے تو انہوں نے ان بنیادوں کو مزید مستحکم کیا اور اشاعت اسلام کے سلسلے مزید آگے بڑھایا۔ علامہ اقبال اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

قیامِ پاکستان کی جدوجہد

تاریخ کے جھروکوں سے جھانک کر دیکھا جائے تو قیامِ پاکستان کے لیے ہمارے آباؤاجداد کی انتھک محنت، طویل جدوجہد اور لازوال قربانیوں کی داستان نظر آتی ہے۔ سر سید احمد خان نے علی گڑھ کالج قائم کر کے مسلمانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ملی تشخص کی اہمیت پر زور دیا اور ان کی معاشی، معاشرتی اور تعلیمی حالت کو بہتر کرنے کی جدوجہد کی۔ علامہ اقبال نے بیداریٔ شعور پر توجہ دی۔ آپ نے نہ صرف اپنے اشعار کے ذریعے اسلامیانِ ہند میں بیداری کی لہر پیدا کی بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں پہنچ کر خطبات دیئے اور اکابر کو خطوط لکھے۔ علامہ اقبال شروع میں قائداعظم کی طرح متحدہ جدوجہد کے قائل تھے مگر حالات و واقعات نے بہت جلد ان پر حقیقت آشکار کر دی اور ان پر ہندو ذہنیت واضح کر دی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو دوہری جنگ لڑنا پڑی۔ ایک فرنگی سے آزادی کی جنگ جسے تحریکِ آزادی کہا گیا جس میں ہندوستان کی تمام قومیں شامل تھیں اور دوسری مسلمانوں کے لیے الگ وطن پاکستان کے قیام کی جنگ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مسلمان قیادت کو دونوں محاذوں پر سرخرو کیا اور وہ انگریز سے آزادی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوئے اور 14 اگست 1947ء کو ایک الگ اسلامی ریاست کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ آج ہم آزاد وطن کی فضا میں سانس لے رہے ہیں مگر افسوس کہ ہم آزادی کی قدر و قیمت سے بے بہرہ ہیں۔ ہم نے نعمتِ آزادی کی قدر نہ کی اور اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو فراموش کر دیا۔

جمہوریت اور آمریت کا کھیل

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے جس طرح اس وطن کی آزادی کے لیے بے مثال سعی کی تھی، اسی طرح اس کی تعمیر و ترقی اور بحالی کے لئے بھی اپنی تمام تر توانائیاں خرچ کر دیں۔ شومیٔ قسمت داعیٔ اجل نے انہیں زیادہ مہلت نہ دی اور وہ قیامِ پاکستان کے تھوڑا عرصہ بعد ہی 11 ستمبر 1948ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی وفات کے بعد پاکستان سیاسی طور پر عدمِ استحکام کا شکار رہا۔ ان کی وفات کے فوراً بعد پاکستان کی باگ ڈور جاگیر داروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ان بدخواہوں اور مفاد پرستوں نے پاکستان کا وہ حشر کر دیا کہ آج ہمیں قائداعظم کے پاکستان کا محض عکس نظر آتا ہے اور حقیقی پاکستان کہیں کھو چکا ہے۔ پاکستانی عوام کے ساتھ جمہوریت اور آمریت کا کھیل کھیلا جاتا رہا۔ نام نہاد جمہوریت کے نام پر جاگیر

دارے، وڈیرے اور سرمایہ دار اس ملک کی زمام اقتدار پر قابض رہے۔ کبھی عوام کو اقتدار میں شریک ہی نہیں کیا گیا۔ سیاست کے پجاری ریاست کو سیاست کی بھینٹ چڑھاتے رہے۔ بعض سیاستدانوں کی عاقبت نااندیشی کے نتیجے میں اس ملک کو آمریت کے بدترین دور سے بھی گزرنا پڑا۔

ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آج سے 77 سال قبل پاکستان انگریز کے تسلط سے تو آزاد ہوا مگر اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی غلامانہ ذہنیت سے آزاد نہیں ہو سکا۔ پاکستان کے 95 فیصد وسائل پر 5 فیصد جاگیر دار، وڈیرے اور سرمایہ دار قابض ہیں۔ ایک طرف عوام بھوک افلاس بے روزگاری اور مہنگائی کی چکی میں پس رہے ہیں اور دوسری طرف امراء کا یہ طبقہ ملکی وسائل کا مالک بنا پر تعیش زندگی گزار رہا ہے۔ غریب روٹی کے لقمے کو ترس رہا ہے اور ملک کے مقتدر طبقہ کے دستر خوان انواع واقسام کے کھانوں سے آراستہ ہیں۔ غریب کے لئے سر چھپانے کو کٹیا بھی میسر نہیں اور امراء نے اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لئے بھی محلات کھڑے کر رکھے ہیں۔ الغرض پاکستان میں غریب روٹی، کپڑے اور مکان جیسی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہونے کے باعث مر رہا ہے اور امیر کثرتِ مال وزر کے باعث ھل من مزید کی طلب میں مرا جا رہا ہے۔ پاکستان کی اس صورتحال کا ذمہ دار صرف ایک طبقہ یا جماعت نہیں بلکہ اس میں تمام طبقے اور جماعتیں حصہ دار ہیں۔ ہر طبقہ کہیں نہ کہیں اس نظام کی خرابی کا ذمہ دار ہے۔

سیاستدان اس لئے ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے سیاست کو کھیل تماشا بنائے رکھا اور حقیقی قیادت فراہم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ انہوں نے قومی سیاست کو فروغ دینے کی بجائے گروہی، مسلکی، علاقائی، اور لسانی سیاست کو فروغ دیا۔ اسی طرح باقی شعبہ ہائے زندگی کی طرف سے بھی بے حسی کا مظاہرہ کیا جاتا رہا۔ کسی نے ملک و قوم کا سرمایہ لوٹ کو بیرون ملک منتقل کرنے والوں کا راستہ نہیں روکا۔ عوام کے پیسوں پر عیاشی کرنے والوں کا احتساب نہیں کیا۔ ملک میں غربت، بے روزگاری اور جہالت کا خاتمہ نہ کرنے والے حکمرانوں سے سوال نہیں کیا۔ کسی نے ملک سے دہشت گردی کے خلاف پالیسی وضع نہ کرنے پر نام نہاد جمہوری حکومت کو بے نقاب نہیں کیا۔ علمائے سوء نے پیٹ بھرنے کی خاطر فرقہ وارایت کو فروغ دیا۔ ہر شخص مہنگائی کی چکی میں پستا رہا، ناانصافی، ظلم و ستم، خوف و ہراس اور بدامنی کے سائے میں جیتا رہا مگر کسی نے اس نظامِ جبر کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے ظالم کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ نام نہاد مصلح باہمی رواداری کی پالیسی اختیار کر کے عوام کے حقوق کی پامالی کا تماشہ دیکھتے رہے اور ان کے زخم پر مرہم رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ سیاسی جماعتوں کی کوشش یہی رہی کہ لوٹ مار پر مبنی اس جمہوریت کو چلنے دیا جائے کہ حالات خود بخود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ کچھ

ضرورت سے زیادہ محتاط جمہوریت کے نام پر ہر سیاہ و سفید کو صرف اس لئے برداشت کرتے رہے کہ مبادا ان کے کسی احتجاجی جلسے جلوس یا ریلی سے جمہوریت کی گاڑی پٹڑی سے اتر جائے۔

عدمِ توازن اور عدمِ مساوات

ہمارے ملک میں تقسیم دولت میں عدمِ توازن اور عدمِ مساوات کے باعث امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس تفاوت کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ملک امیر لوگوں کے رہنے کے لیے بہت شاندار ہے، یہاں ان کی خدمت کے لیے غریبوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ ان کے کھانے بنانے کے لیے باورچی، بچوں کی دیکھ بھال کے لیے آیائیں، ان کو گھمانے کے لیے ڈرائیور، فرش صاف کرنے کے لیے خاکروب اور ان کے گلاب کو کھلانے کے لیے مالی موجود ہیں۔ پھر، ان کے لیے خصوصی کلب، لوگوں کے رہنے کے لیے مخصوص علاقے، اعلیٰ سکول اور کالجز اور ہر قسم کی تکلیف دور کرنے کے لیے ہسپتال موجود ہیں۔ یہ خوشحالی کے جزیرے غربت کے گرداب میں مینار کی طرح چمکتے ہیں۔

امیر ہونا کوئی جرم نہیں ہے اور موقع ملے تو ہر کوئی امیر بننا چاہے گا لیکن مسئلہ عدمِ توازن کا ہے۔ اس ریاست میں اکثریت کا ایک بڑا حصہ غربت کی زندگی گزارتا ہے۔ پاکستان میں عدم مساوات کا یہ حال ہے کہ اوپر کے 10 فیصد لوگ قومی آمدنی کا 42 فیصد کماتے ہیں اور نیچے کے 50 فیصد صرف 13 فیصد کماتے ہیں۔ ورلڈ بینک کے حالیہ اندازے کے مطابق، 2024 میں پاکستان کی آبادی کا 40 فیصد حصہ غربت کی لکیر سے نیچے چلا گیا ہے۔

بچوں کے بارے میں کچھ اعداد و شمار دل دہلا دینے والے ہیں۔ یہ بات اکثر دہرائی جاتی ہے کہ 24 ملین بچے اسکول سے باہر ہیں جو باعث شرمندگی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ہمارے پانچ سال سے کم عمر کے بچوں میں سے 44 فیصد کی نشو و نما وہ نہیں ہے جو ہونی چاہئے اور یہ بڑی حد تک نامناسب خوراک کی وجہ سے ہے۔

استحکامِ پاکستان کیونکر ممکن ہے؟

پاکستان کے پاس صلاحیت اور وسائل کی کمی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر موسم کی نعمت سے سرفراز کیا ہے۔ اس کی جغرافیائی حدود بھی ہر حوالے سے مثالی ہیں۔ سمندر، خشکی، پہاڑ، جنگلات، میدانی علاقے الغرض ہر چیز اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح یہ ملک عظیم دفاعی جوہری توانائی کا بھی حامل ہے مگر اس کے باوجود ہم طرح طرح کے مسائل کا شکار ہیں۔ پاکستان کا نظام مجموعی طور پر خرابی کا

شکار ہے۔ اس نظام کو درست کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ جب تک یہ نظام درست نہیں ہوتا، پاکستان میں خاطر خواہ تبدیلی نہیں آسکتی۔ نظام انتخابات، نظام عدل، نظام تعلیم میں انقلابی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں تمام انتظامی اداروں میں اصلاحات کی ضرورت ہے تاکہ کرپشن کا بازار گرم کرنے والے عناصر کا قلع قمع ہو سکے۔

ہر حکومت ایف بی آر اور دیگر اداروں کو ایک ہدف فراہم کرتی ہے۔ اس ہدف کو پورا کرنے کے لیے وہ سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے ہر بجٹ میں کوئی نہ کوئی نئے ٹیکس نافذ کر دیئے جاتے ہیں۔ ان ٹیکسوں نے عوام کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کی اہل ثروت کو ٹیکس کے دھارے میں لایا جائے اور ان سے ٹیکس وصولی کا شفاف نظام ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ٹیکس خزانے تک پہنچنے سے پہلے ہی خرد برد کا شکار ہو جائے۔ اس حوالے سے موجود قوانین پر عمل درآمد کرایا جائے۔ عام آدمی جو بمشکل گھر چلاتا ہے اس پر ٹیکسوں کا بوجھ لادنا سرے سے ناانصافی ہے۔

ہمارا ملک اس وقت تک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا جب تک یہاں لوٹ کھسوٹ کا بازار ختم نہیں ہوتا۔ یہاں ایک کڑے احتساب کی ضرورت ہے۔ ہر آنے والی حکومت احتساب کا نعرہ لگاتی ہے مگر وہ نعرہ سیاست کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے اور احتساب کے ادارے حکومت کے آلہ کار بن کر ان کی خدمت پر مامور ہو جاتے ہیں۔

جوانوں کو پیروں کا استاد کر

میں سمجھتا ہوں ایک مسلمان کے لیے مایوسی گناہ ہے، وہ ماضی سے سبق سیکھتا ہے اور حال کے ذریعے اپنے مستقبل کی تعمیر کرتا ہے۔ الحمدللہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم قطعی طور پر مایوس نہیں۔ ہم اپنی نوجوان نسل سے پر امید ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال نے ہمیشہ نوجوانوں کو قوم کا ہراول دستہ قرار دیا۔ آج کا نوجوان بیدار ہو چکا ہے۔ ہماری قوم کا نوجوان تعلیم یافتہ، ہنر مند اور باصلاحیت ہے۔ یہ نوجوان اگر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے تو یہ علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق کہلائے گا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

رہنمایان قوم اور ارباب اقتدار کا فرض بنتا ہے کہ نوجوانوں کی تربیت کریں۔ ان کی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے ملکی و غیر ملکی سطح پر مواقع فراہم کریں۔ ان کی علمی و فنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں سہولیات فراہم کریں۔ ہمارے نوجوانوں میں وہ ہمت اور جذبہ ہے کہ یہ فضاؤں میں اڑ سکتا

ہے، سمندر کا سینہ چاک کر سکتا ہے، فلک بوس پہاڑوں کو سر کر سکتا ہے۔ یہی نوجوان بہترین افراد بن کر ملک کی باگ ڈور سنبھال سکتے ہیں اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن کر کے قوم کے مقدر کو بدل سکتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو آگے لائیں، انہیں جدید علوم سے آراستہ کریں۔ اس کے دل میں اپنی مٹی کی محبت کا فلسفہ جا گزیں کریں تا کہ اس ملک کا ڈاکٹر، انجنیئر، سائنسدان اور معیشت دان اپنی صلاحیتوں سے اغیار کو فائدہ پہنچانے کی بجائے اپنے وطن کی خدمت کو ترجیح دے۔ قلندر لاہوری نے کہا تھا:

اگر جواں ہوں میری قوم کے جسور و غیور
قلندری میری کچھ کم سکندری سے نہیں!

علامہ اقبال ارمغان حجاز میں اپنی نظم بعنوان "بڑھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" میں نوجوانوں کو اپنی سرزمین کی قدر و قیمت اور اہمیت سے آشنا کرتے ہوئے اس سے جڑے رہنے کی نصیحت کرتے ہیں:

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل

وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا

وہ نوجوانوں کو قومی وملی غیرت وحمیت کا سبق دیتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

کسی بھی قوم کا نوجوان اس قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ پاکستانی نوجوان پاکستان کا اثاثہ اور مستقبل ہیں۔ علامہ اقبال ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے اور اپنے اشعار میں ان سے مخاطب ہو کر ان کی ہمت اور ولولے کو جواں رکھتے۔ وہ نوجوانوں کو فکری طور پر آزاد دیکھنا چاہتے تھے:

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
میرا عشق میری نظر بخش دے

تجدیدِ عہدِ وفا

14 اگست ہمارا یوم آزادی ہے۔ یہ دن تجدیدِ عہد و وفا کا دن ہے۔ اس دن ہم میں سے ہر ایک نے ایک پاکستانی کی حیثیت سے عہد کرنا ہے کہ میں وطن عزیز کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔۔۔ ملکی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دوں گا۔۔۔ میں علم و ہنر کی شمع لے کر وطن عزیز میں موجود تاریکیوں کو اجالوں میں بدلوں گا۔۔۔ میں اس دھرتی کے ساتھ وفادار رہوں گا اور اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔ انہوں نے اپنے خون سے اس وطن کی بنیاد رکھی تھی میں اپنے خون سے اس وطن کی آبیاری کروں گا۔ یہ ہے وہ عزم و ہمت جو ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہونی چاہیے۔ کیونکہ پاکستان ہمارے دل کی دھڑکن ہے، پاکستان ہماری جان ہے پاکستان ہماری آن بان اور شان ہے۔ اس موقع پر ہم بانی پاکستان قائدا عظم محمد علی جناحؒ کے احسان مند ہیں اور ابصار عبد العلی کے منظوم کلام کی صورت میں انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

تو بابِ قیادت ہے معیارِ سیاست ہے
تو قیرِ فراست ہے تو حسنِ صداقت ہے
تو قوم کا سرمایہ تو قوم کی عظمت ہے

تو کتنا بڑا انسان اے بانیٔ پاکستان
تو قائدِ اعظم ہے تو جہد مجسم ہے
شعلوں پہ مسائل کے تدبیر کی شبنم ہے
آزادئ پاک وطن تیری کاوشِ پیہم ہے

وطن کے لیے دعا

اہل حکومت و سیاست کی مکاریوں اور فریب کاریوں کی وجہ سے میرے وطن کا یہ حال ہے میں رب قادر سے احمد ندیم قاسمی کی اس دعائیہ نظم کے ذریعے اس کی خوشحالی کی دعا کرتا ہوں:

خدا کرے میری ارض پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے برسوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اُگے وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو
گھنی گھٹائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں
کہ پتھروں کو بھی روئیدگی محال نہ ہو
خدا کرے نہ کبھی خم سرِ وقارِ وطن
اور اس کے حسن کو تشویش ماہ و سال نہ ہو
ہر ایک خود ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو کوئی خستہ حال نہ ہو
خدا کرے کہ میرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

سینئر ریسرچ اسکالر فرید ملت ریسرچ انسٹیٹیوٹ

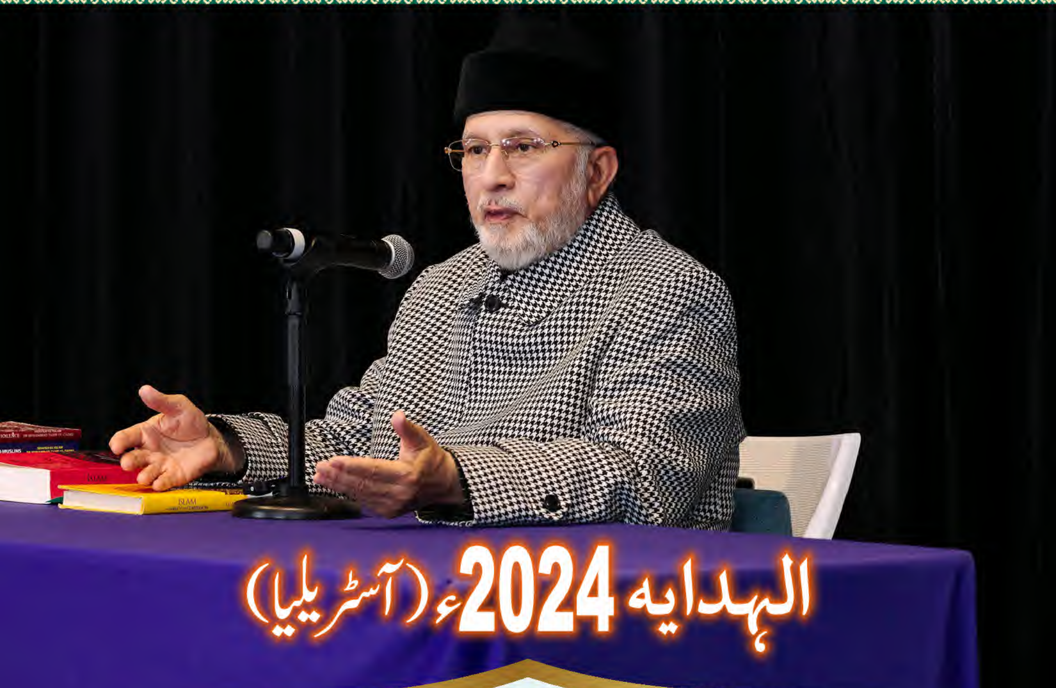

الہدایہ 2024ء (آسٹریلیا)

خصوصی رپورٹ

انسانوں کے وضع کردہ نظریات وقت کے ساتھ تبدیل اور رد ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ سائنسی انکشافات میں بھی ردوبدل کا عمل جاری ہے۔ ایک وقت تھا کہ زمین کو ساکن قبول کر لیا گیا تھا پھر زمین کے تحرک کا نظریہ آیا تو اسے قبولِ عام حاصل ہوا۔ مادی زندگی کے اندر ہم تسلسل کے ساتھ ردوبدل کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ جو نظریہ ایک زمانے میں حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے مگر چند سال یا صدی دو صدی کے بعد وہی نظریہ باطل ٹھہرتا ہے۔ ردوبدل کی یہ فلاسفی فقط سائنس تک محدود نہیں ہے بلکہ سیاسیات، معاشیات سمیت انسانی زندگی کا ہر شعبہ اور علم کی ہر شاخ اس تغیر و تبدل کی زد پر ہے۔ اس تمام جدوجہد کے بعد انسان کے سامنے وہ حقیقت آجاتی ہے جس کا نام مذہب یا خدائی قانون ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو انسانی تخلیات سے بلند ہے اور جسے خالق ارض و سماوات نے عالمِ انسانیت کے لئے قول فیصل کے طور پر تجویز فرمایا ہے۔

مذہب انسانی زندگی کو مضبوط، منظم، مربوط اور مستحکم بناتا ہے۔ مذہب اگر ایک طرف اخلاق و عادات درست کرتا ہے تو دوسری جانب ترقی کے وہ تمام پوشیدہ خزانے سامنے لاتا ہے جہاں ظاہری آنکھ نہیں پہنچ سکتی۔ مذہب انسان کو جوہر کامل بنانا چاہتا ہے۔ مذہب کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کے سامنے مکمل نظامِ عمل پیش کرے تاکہ انسان اس وسیع اور جامع دستور پر چل کر کامیاب ہو اور مقصودِ حیات

تک پہنچ سکے۔ یہ عزت و شرف فقط قرآن کریم اور سیرتِ نبویہ ﷺ کو حاصل ہے کہ اس نے دنیا کے سامنے جامع ہدایات اور نظامِ معاشرت پیش کیا۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر انسانیت کے سامنے رکھا اور اصحاب کی ایک ایسی جماعت تیار کی جس نے الوہی احکامات اور نبوی سیرت پر عمل پیرا ہو کر زمین پر ایک ایسی مضبوط و مستحکم سلطنت قائم کی جس کا نظامِ زندگی کسی اور نظام سے مستعار نہیں لیا گیا تھا بلکہ اس کا ایک ایک عمل براہِ راست سیرتِ طیبہ اور قرآن مجید سے حاصل کیا گیا تھا اور جب عرب کے سیدھے سادھے لوگوں نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کے شجرِ سایہ دار میں پناہ لی تو یہی فقر و فاقہ میں زندگیاں بسر کرنے والے رسالت مآب ﷺ کے فیض و صحبت و معیت کی برکات سے ترقی یافتہ اقوام کے امام بن گئے۔ اصحاب رسول ﷺ کی اس تربیت یافتہ جماعت نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ اسلام ہی ترقی کا مرکز و مخزن ہے۔ اسلام نے دینی و دنیوی ترقی، خوشحالی کی منزل کی پہلی سیڑھی علم اور تقویٰ کو قرار دیا ہے اور قرآن مجید کو علوم و فنون اور ہدایت و راہ نمائی کا مصدر و منبع قرار دیا ہے اور یہ شرط رکھی ہے کہ قرآن مجید پر غور فکر کرو، عقل و تدبر سے کام لو اور کائنات میں جابجا پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیوں کو سمجھو اور ان سے کسبِ علم و فیض کرو۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دینِ حمید کے اس پیغام کو دنیا بھر میں عام کرنے کے لئے تصنیف و تالیف اور تحریر و تقریر کے ذریعے اپنا باوقار اسلامی کردار ادا کر رہے ہیں۔ شیخ الاسلام کی توجہ کا مرکز اُمہ کے نوجوان ہیں۔ بالخصوص عالمِ مغرب میں نسل در نسل آباد نئی نسل کی اسلامی نہج پر تعلیم و تربیت کے لئے وہ دن رات کوشاں ہیں اور خدمتِ دین کے اس مشن کو جاری رکھتے ہوئے وہ اپنی صحت و آرام کو بھی خاطر میں نہیں لا رہے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری گزشتہ دو ماہ سے مغربی ممالک کے تنظیمی و تبلیغی دورہ پر ہیں۔ جون 2024ء انہوں نے برطانیہ اور یورپ میں اسلامک سکالرز، سول سوسائٹی، طلبہ و طالبات اور مختلف مکاتبِ فکر کے افراد کے ساتھ فکری نشستیں منعقد کیں اور انہیں یہ پیغام دیا کہ اسلام انسانیت کی بقا اور امن عالم کی دائمی حفاظت کا ضابطۂ حیات ہے۔

جولائی 24ء میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ نے آسٹریلیا میں 3 روزہ الھدایہ تربیتی کیمپ سے فکر انگیز خطابات کیے۔ اس کیمپ میں خواتین، بچے، جوانوں، سول سوسائٹی کے نمائندوں اور مختلف مکتب فکر کے افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ الھدایہ کیمپ (آسٹریلیا) میں امریکہ، یورپ اور برطانیہ سے بھی تشنگانِ علم شریک ہوئے۔ بلاشبہ آسٹریلیا کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا تربیتی، اخلاقی و اصلاحی کیمپ تھا۔ اس تربیتی و اصلاحی دورہ کے موقع پر منہاج القرآن انٹرنیشنل کی سپریم

کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر حسن محی الدین قادری، پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری، ڈاکٹر غزالہ قادری، فضہ حسین قادری، شیخ حماد مصطفی المدنی القادری نے بھی خصوصی شرکت کی اور مختلف مواقع پر اپنے فکر انگیز خطابات سے سامعین کو مستفید کیا۔

الہدایہ کیمپ کے پہلے روز برن ہال میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے ایمان اور غیب کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیاوی امور میں کوئی چیز خریدتے وقت پہلے ہم تسلی کرتے ہیں کہ اس میں کوئی خرابی نہ ہو، وہ ایکسپائر نہ ہو، اس میں کوئی نقص نہ ہو۔ ہم اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے اس چیز کے بہترین حالت میں ہونے کی تسلی کر لیتے ہیں پھر اُسے خریدتے ہیں اگرچہ تسلی کر لینے کے بعد بھی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی کہ وہ چیز درست حالت میں ہے یا نہیں۔ بہرحال ایمان کا وہ حصہ جس کا تعلق غیب سے ہے اُسے من و عن تسلیم کرنا ہی ایمان ہے۔ ہم سوال و جواب کئے بغیر اللہ کے وجود کو تسلیم کریں گے۔ ہمیں آسمانی کتب کو سوال و جواب کے بغیر حق تسلیم کرنا ہے۔ پیغمبرانِ خدا پر سوال و جواب کے بغیر ایمان لانا ہے۔ سوال و جواب کے بغیر جنت، دوزخ، یوم آخرت پر ایمان لانا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مجھ پر ایمان لانے کے سودے میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آغاز میں ہی فرمایا دیا ”لاریب“ خبردار اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے اور قرآن مجید کو غلطیوں سے پاک سمجھتے ہوئے اس پر یقین کامل رکھنا، اس کے اندر بیان کئے گئے واقعات اور احکامات کو انسانیت کے لئے نفع بخش سمجھتے ہوئے شک و شبہ سے بالاتر ہو کر اس پر عمل پیرا ہونا ایمان ہے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے ایمان کے بنیادی فلسفہ پر سادہ اور دل نشیں انداز میں گفتگو فرمائی۔ ایمان بالغیب ایمانیات کے باب میں ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس پر عمل پیرا ہوئے بغیر انسان ایمان کی حلاوت کو نہیں پاسکتا۔ ایمان بالغیب کے ضمن میں شک کو کاٹ پھینکنا شرط اول ہے۔ ہر ایمان والے کو اس بات کا راسخ یقین ہونا چاہیے کہ ہدایت کی دولت اللہ کی طرف سے نصیب ہوتی ہے۔ زندگی اور موت کا مالک اللہ ہے۔ رزق دینے والا اللہ ہے۔ رزق میں تنگی اور کشادگی عطا کرنے والا اللہ ہے۔ جب اللہ پر یقینِ محکم اور یقینِ کامل کی دولت حاصل ہو جاتی ہے تو بندہ بندگی کی معراج پالیتا ہے۔

شیخ الاسلام نے شرکائے الہدایہ کیمپ کو نصیحت کی کہ ایمان بالغیب اور اللہ کی ذات پر کامل یقین رکھنے کی دولت حاصل کرنے کے بعد تزکیہ نفس پر توجہ دی جائے۔ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ ہر وقت خدائے پاک کے احکام کا خیال کرتا رہے۔ اعمالِ صالح کا پابند ہو، اپنے دل میں اللہ کی عظمت کو قائم کرے، ہر عمل میں ڈرتا رہے۔ خدا سے ڈرنے کے یہ معنی ہیں کہ بندہ اس کی مرضی کے تابع ہو۔ کوئی کام اس کے خلاف نہ ہو۔ ایمان کی دولت حاصل کرنے کے بعد وہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے اور

احکامِ الٰہیہ پر ہر حال میں عمل پیرا رہے۔

شیخ الاسلام نے ایمان کی فلاسفی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضور نبی اکرم ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے تو وہ خانہ کعبہ کی طرف رخ انور کر کے نماز پڑھتے۔ ہجرت مدینہ کے بعد ظاہری طور پر خانہ کعبہ سامنے نہیں تھا تو مدینہ میں تشریف لانے کے بعد آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ انور کر کے نماز ادا فرماتے۔ مدینہ میں یہود بھی آباد تھے۔ یہودیوں کا کعبہ یروشلم بیت القدس تھا۔ ہجرت مدینہ کے بعد انصار مدینہ میں سے جو یہودی مسلمان ہو گئے تھے اور وہ آپ ﷺ کی معیت میں القدس کی طرف منہ کر کے عبادت کرتے تھے، وہ تو بہت خوش تھے چونکہ ان کی القدس کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی تھی۔ ہجرت مدینہ کے ڈیڑھ سال تک القدس کی طرف رخِ انور کر کے عبادات کا سلسلہ جاری رہا پھر ایک روز دوران نماز حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنا چہرہ مبارک القدس سے ہٹا کر خانہ کعبہ کی طرف پھیر لیا۔ نماز کی حالت میں وحی نازل ہوئی کہ آپ پہلے جس قبلہ پر تھے، ہم نے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم پرکھ کر ظاہر کر دیں کہ جب آپ قبلہ کا رخ بدلیں تو کون لوگ ہمارے اس محبوب رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے اپنا رخ پھیر لیتے ہیں اور کون نہیں پھیرتے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے اس آیت کریمہ کا پس منظر بیان فرماتے ہوئے کہا کہ ہجرت مدینہ کے بعد دو طرح کے اصحاب رسول ﷺ تھے ایک وہ جو مکہ میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور ہجرت کر کے مدینہ آ گئے اور دوسرے وہ مسلمان جو مدینہ میں تھے اور القدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے یعنی کچھ اصحاب رسول ﷺ خانہ کعبہ سے مانوس تھے اور کچھ اصحاب رسول ﷺ بیت المقدس سے مانوس تھے۔ یہاں اللہ نے ایمان کا امتحان لیا کہ کون شک وشبہ سے بالاتر ہو کر سوال وجواب کئے بغیر میرے نبی برحق پر ایمان لاتے ہوئے اپنا رخ تبدیل کرتے ہیں اور کون شک وشبہ اور سوال وجواب میں پڑتے ہیں؟۔ قرآن نے کہا شک وشبہ کے بغیر اطاعتِ رسول کے تحت رخ بدل لینا بڑی بھاری بات تھی اور اللہ کو بن دیکھے ماننے والوں کو ہدایت اور ایمان کی دولت عطا کرتا ہے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے الہدایہ تربیتی کیمپ میں توبہ کے موضوع پر انتہائی شاندار اصلاحی خطاب کیا اور کہا کہ انسانی زندگی میں توبہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت سارے مقامات پر بندوں کو توبہ کی تلقین فرمائی ہے۔ گناہ گاروں کو مایوسی سے بچانے کے لئے خود اعلان فرمایا ہے کہ میری رحمت ہر شے پر غالب ہے۔ انہوں نے شرکائے کیمپ کو نصیحت فرمائی کہ کبھی اپنے صالح اعمال پر تکبر نہ کریں اور عجز وانکساری کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے رہیں۔ عاجزی، انکساری اور توبہ اللہ کو بے حد پسند ہے۔

(جاری ہے)

سیرت و فضائلِ نبوی ﷺ کے ذکرِ جمیل پر مشتمل عظیم ذخیرۂ علم

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی گراں قدر تصانیف

Monthly MINHAJ-UL-QURAN LAHORE
AUG-2024
Regd CPL No.41

ADMISSIONS FALL 24

Minhaj University Lahore

Ph.D. | M.Phil | BS | BS 5th SEMESTER | ADP

IN THE FACULTIES OF

ALLIED HEALTH SCIENCES

APPLIED SCIENCES

BASIC SCIENCES & MATHEMATICS

COMPUTER SCIENCE, INFORMATION TECHNOLOGY & SOFTWARE ENGINEERING

ECONOMICS & MANAGEMENT SCIENCES

ENGINEERING AND TECHNOLOGY

LANGUAGES

LAW

SOCIAL SCIENCES & HUMANITIES

Apply Now

03 111 222 685, 042 35145629   www.admission.mul.edu.pk
Minhaj University Lahore, Madar-e-Millat Road,
Near Hamdard Chowk, Township Lahore